ناولٹ

بڑی گھنگور گھٹا تھی آنا "فانا" پورے آسمان پر چھا گئی۔ اندھیرا سا ہو گیا حالانکہ ابھی سہ پہر کا وقت تھا نذیراں نے گیہوں چھننے بند کیے اور جلدی جلدی بوری میں بھرنے لگی' اس کی بیٹی صاف گندم دوسرے تھیلے میں ڈال کر برآمدے کی طرف لپکی اور جھاڑو لا کر بکھری ہوئی گندم سمیٹنے لگی۔ شمشاد ڈوری سے دھلے ہوئے کپڑے اتار رہی تھی ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ کمرے سے دادی چلائی۔ "ارے پلنگ تو اندر کر دو بھیگ کر غارت ہو جائیں گے۔"

"میں کپڑے اتار رہی ہوں۔" شمشاد نے زور سے کہا۔

"نذیراں بیٹی تو ہی اٹھا لے پلنگ۔"

"میں گندم نا سمیٹوں؟" نذیراں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"وہ آصف کہاں گیا؟" چچی بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے آئینے کے سامنے سے بولیں۔

"وہ کم بخت کھیل رہا ہو گا کہیں"

"بارش آئے' چاہے طوفان' اسے پیٹ بھرنے کے سوا آتا کیا ہے"

"اری نذیراں! اسمیٹ چک اپنی گندم" دادی نے اندر سے کہا "پلنگ بھیگ گئے تو کا ہے پہ سوئیں گے سب"

"میرے سر پر" نذیراں چپکے سے بولی۔ اور بوری میں ستلی سے گرہ دے کر بوری گھسیٹ کر برآمدے میں

آسیہ رزاقی

بہت کٹھن سفر

کرنے لگی۔ "چل شمو! پلنگ اندر کروا لے۔"
"میں کپڑے نہ اتاروں؟ چار گھنٹے بیٹھ کر دھوئے ہیں۔" شمشاد ٹنک کر بولی۔
"یہ آصف کہاں مر گیا۔" چچی کنگھا بیچ کر بولیں۔
"پڑھنے گیا ہے۔" دادی اماں نے بتایا۔
"ہاں پڑھ کر تو اسے کمشنری کرنی ہے گھر میں جو کام پڑا ہے وہ اس کا باپ کرے گا۔"
آصف چپکے سے اندر آ گیا تھا اس نے پلنگ گھسیٹا تو چچی چیخ پڑیں "ارے ارے اٹھا کر لا نہیں تو پائے ٹوٹ جائیں گے۔" ٹھنڈی ہوا کے ساتھ برف جیسی پھوار اس کے چہرے پر گری تو وہ لڑکھڑا گیا۔ چچی نے پھر کہا۔
"اب جلدی کر نامراد' بھیگ جائے گا تب اٹھائے گا کیا؟" مگر وہ چھوٹا تھا اور پلنگ بڑا بڑی مشکل سے کمر پر پلنگ لادا مگر اس کے پائے ابھی زمین پر ہی گھسٹ رہے تھے۔ دادی نے اندر سے پھر کہا "نذیراں ذرا ہاتھ لگا لے۔"
"ہاں نذیراں تو خالی بیٹھی ہے۔" چچی نے تلملا کر کہا اور آصف کو دھکا دے دیا وہ پلنگ سمیت گر گیا۔
"اٹھا لوں گی میں خود۔" انہوں نے زور سے کہا "اس نواب زادے کو تکلیف نہ ہو بس۔"
آصف گرا تو کہیں سے ہنسی کی آواز آئی مگر اسے اٹھانے کوئی نہ آیا چچی نے غصہ میں پلنگ اٹھا تو لیا تھا مگر جب ٹھنڈے پانی کا ایک زوردار ریلا آیا تو وہ سنبھل نہ سکیں' پلنگ گرا باہر اور وہ برآمدے میں' ہائیں ہائیں کرتے چچا رجسٹر بغل میں دبائے باہر سے اندر آئے تو چچی کو دیکھ کر بولے "ارے! یہ کیا ہو رہا ہے؟"
"چوٹ لگ گئی۔" چچی نے کلائی پکڑی اور بسورنے لگیں چچا خفا ہونے لگے کہ "پلنگ اٹھانے کی انہیں کیا ضرورت تھی نوکر مر گئے کیا؟ اور یہ آصف جو موجود تھا مسٹنڈا۔"
"وہ کیوں کرے کوئی کام۔" چچی سوں سوں کر کے رونے کی کوشش کرتے ہوئے منمنائیں "وہ تو ہوا لاڈلا! ایک میں ہی ہوں زر خرید لونڈی مجھ ہی پر سب کا زور چلتا ہے۔"

چچا آصف کا کان پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنی ماں کے کمرے میں آئے دھکا دے کر دادی کے پلنگ پر پٹخا اور دندناتے پیر پٹختے باہر چلے گئے بغیر کچھ کہے۔ آصف گر کر رونے لگا' دادی دم بخود دروازے کی سمت دیکھتی رہ گئیں۔ جب بارش خوب تیز ہو رہی تھی تو چھوٹے چچا پانی میں شرابور بھاگتے ہوئے آئے آصف کو حکم دیا کہ "باہر دوڑ کر چلے جاؤ پیپل کے نیچے تیز گام کھڑا ہے اسے چھپر میں باندھ آؤ۔ دانہ پانی بھی دے آنا۔ سترہ میل سے آ رہا ہے ایک ساں۔"
"بیٹا! تو تم ہی باندھ آتے اسے۔ بھیگ تو چکے ہو' بچے کو بیمار ڈالنا ہے کیا؟"
چچا ڈوری پر سے تولیہ اتار رہے تھے مڑ کر تند لہجے میں بولے "اماں! ہر بات میں اس کی حمایت نہ کرو۔"
آصف باہر چلا گیا تو دادی نے کہا "میں حمایت نہیں کرتی مگر خود سوچو بیمار ہوا تو کون دیکھ بھال کرے گا اس کی؟"
"تو میں [illegible]" چچا بگڑ کر بولے
"تم تو [illegible] بھیگ چکے ہو ایک [illegible] جانے دو وہ بچہ ہے۔" دادی نے نرم لہجے میں کہا۔
آصف تیز گام کی رسی تھام چکا تھا گھوڑا اسے پہچان کر زمین پر کھسار رہا تھا۔ کان پھٹپھٹا رہا تھا' وہ اسے لے کر تھپکتا ہوا چھپر کی طرف جانے ہی والا تھا کہ آندھی طوفان کی طرح چھوٹے چچا نکلے ہوئے ڈوری آصف کے ہاتھ سے چھین کر بولے "رہنے دو [illegible] گا۔" وہ گھوڑے کو لے گئے۔ زمین پر پڑا آصف اندھیرے میں بارش کو گھورتا رہ گیا۔
کاش چھوٹے چچا نے تھپڑ مار دیا ہوتا مگر ان کی تلخ آواز اور ترش لہجہ آصف سے برداشت نہ ہوتا تھا جب وہ پہلی بار بڑے چچا کے ہاتھ پٹا تھا تو بہت رویا تھا مگر اب وہ اتنی بار اور اتنے لوگوں سے مار کھاتا رہتا تھا کہ اسے نہ کوئی دکھ ہوتا' نہ آنسو نکلتے بس کبھی کبھی دادی کے پاس جا کر سسکنے لگتا وہ اسے تھپکتی جاتیں۔ اور دنیا جہان کے ہاتھ ٹوٹنے کی دعا کرتی رہتیں سیما منہ چھپائے کھی کھی کر کے ہنستی' سیما کی تو بات ہی اور تھی

وہ بڑے چچا اسلم زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑی منت مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی اسلم زمیندار بڑے جوڑ توڑ والے آدمی تھے انہوں نے اپنی فہم و فراست اور چالاکی سے نہ صرف اپنی زمین دور تک پھیلا دی تھی۔ بلکہ شہر میں کارخانہ کھول لیا تھا۔ اظہر کو بس ٹریکٹر اور تیز گام ہی سے دلچسپی تھی تیز گام نے آس پاس کے تمام علاقوں کی ہر گھوڑ دوڑ میں انعام حاصل کر کے ان کا سر بلند کر دیا تھا۔ اب وہ شہر جا کر اسے آزمانا چاہتے تھے مگر بھیا یعنی اسلم زمیندار اجازت نہیں دیتے تھے۔ اظہر کو آصف سے محبت تھی نہ دشمنی مگر اسلم زمیندار اور ان کی بیوی کی زبانی اس کی شکایت سن سن کر اس سے چڑ ضرور ہو گئی تھی۔ وہ بہت گندا رہتا' ہاتھوں پر میل کی تہیں گندے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے' جانے منجھلے بھائی کی یہ اکلوتی اولاد کس پر پڑی تھی۔ خاندان میں تو کوئی ایسا نہیں تھا جب [illegible] سوں کے بعد منجھلے بھیا اچانک آن وارد ہوئے تو گھر میں طوفان سا آ گیا ابا جان غصے سے [illegible] لگے
بڑے بھیا [illegible] لگے بھابھی [illegible] لہجے میں کچوکے دینے لگیں مگر وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد بیٹھے رہے۔
"میری زمین پر تیرا حبہ بھر حق نہیں ہے۔" ابا جان سرخ انگارہ چہرہ لیے لرز رہے تھے۔
"اب کس لیے آیا ہے۔ جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جا [illegible] تیری صورت نہ دیکھوں۔" منجھلے بھیا نظریں نیچی کیے خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے پیروں کے پاس تین سال کا آصف بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے خاموش بیٹھے باپ کو' کبھی چنگھاڑتے ہوئے آگ بگولہ دادا کو' اور کبھی زور زور سے پیر مارتے ٹہلتے ہوئے ہونٹ دانتوں میں چباتے بڑے چچا اسلم زمیندار کو دیکھتا اور پھر کرسی کا ہتھا زور سے پکڑ کر پیر سے پیر رگڑتا اس نے موٹی ململ کا کرتا اور دھاری دار گھٹیا کپڑے کا پاجامہ پہن رکھا تھا اس کا پیٹ جسم کے مقابلے میں بہت پھولا ہوا تھا وہ کبھی ایک ٹانگ کبھی دوسری ٹانگ پر زور دے کر کھڑا ہوتا اور پھر منمنا کر باپ سے کچھ کہتا

مگر منجھلے بھیا اس کے وجود سے شاید بے خبر زمین پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے' سامنے پلنگ پر اماں بی مونگ کی بڑیاں توڑ رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی پتلی پتلی پھٹکیاں سی آصف ان کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ تھال میں لائن سے بڑیوں کی قطار بڑھتی جا رہی تھی۔
"گندا خون گندا ہی ہوتا ہے ابا جان آپ نے انہیں کیا بنانا چاہا' یہ کیا بن گئے ہیں۔ ہیں ہمارے ساتھ بیٹھنے کے لائق؟" بڑے بھیا ابا جان کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر ایک بار پھر بول پڑے۔
بڑے بھیا مسلسل روئے رہے منجھلے بھیا ضبط کر رہے تھے' ان کے جبڑے کی رگیں پھولنے لگی تھیں مگر پھر بھی وہ کچھ نہ بولے۔ ایک لمحے میں انہوں نے جیسے خود پر قابو پا لیا اب پھر جامد چہرہ ساکت نظریں پتھر کے مجسمے کی طرح خوبصورت عالی شان۔
"کہاں گئی وہ جس کے لیے بن باس لیا تھا۔ گھر بار چھوڑا در بدر ہوئے' میں کہتی ہوں اس نے تم کو دیا کیا؟"
بھابھی مسلسل طعنے دیتی رہیں آصف نے ہاتھ بڑھا کر منجھلے بھیا کا کاندھا تھام لیا۔
"ابا بھوک لگی ہے" منجھلے بھیا کے جسم میں حرکت ہوئی انہوں نے ایک انگلی سے اپنی پلکوں پر اٹکے آنسو کو پونچھ دیا۔
"شعلہ! بچے کے لیے کھانا لے آ۔" اماں بی نے نظریں اٹھائے بغیر کہا "منجھلے بھیا کے لیے بھی لے آ۔"
ایک سینی میں کھانا لے کر جب دوبارہ شعلہ آئی تو اظہر آصف کو کھانا کھاتے دیکھ رہا تھا۔ اماں بی کا مر بھکوں اور بھکنے کا محاورہ آج سمجھ میں آیا وہ مر بھکوں کی طرح کھانا بھکس رہا تھا' دونوں ہاتھوں سے۔ اظہر نے دیکھا نہیں بس محسوس کیا جیسے بڑے بھیا چیل کی طرح جھپٹے اور شعلہ کے ہاتھ سے کھانے کی سینی ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین بوس ہو گئی۔
"ہرگز نہیں" وہ چلائے "اس گھر کی روٹی اس کے لیے حرام ہے" تب منجھلے بھیا نے گردن اٹھا کر بے باکی

سے بڑے بھیا کو دیکھا بڑے بھیا ان نظروں کی تپش کی تاب نہ لاسکے اور پیچھے ہٹ گئے منجھلے بھیا کا چہرہ شفق رنگ ہو گیا ان کی آنکھیں خون اگلنے لگیں شاہوں جیسا جاہ و جلال پر شکوہ، منجھلے بھیا کا قد بھی سب سے لمبا تھا وہ کھڑے ہو گئے تھے۔

"پہلے بھی آپ نے میرا جینا حرام کر دیا تھا اس گھر میں" انہوں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بڑے بھیا سے کہا اسی وقت اماں بی نے جھکا ہوا سر اٹھا کر بڑے بھیا کی طرف دیکھا ان کا چہرہ بھی غضب ناک ہو رہا تھا۔ ازار بند ٹٹول کر انہوں نے چابی کا گچھا نکالا اور شعلہ کی طرف پھینکا "جا شعلہ! الماری سے بسکٹ اور حلوہ نکال لا۔ میرے گھر سے کوئی مہمان بھوکا نہیں جاسکتا۔ روٹی حرام کی ہے اسلم نے حلوہ نہیں' جا" شعلہ اندر لپک گئی اماں بی پھر اسی اطمینان سے بڑیاں توڑنے لگیں۔

"حرام اور حلال کی کوئی تمیز نہیں رہی اماں بی" منجھلے بھیا نے درد بھرے لہجے میں کہا پیٹ پر ہاتھ مار کر غصہ اور بے بسی سے انہوں نے پھر کہا

"یہ ایسا ظالم ہے کہ بھیک تک منگوا دیتا ہے۔"

اظہر کے دل پر چوٹ سی لگی وہ بڑے بھیا سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا مگر اس کا دل ان کے ظلم پر غم اور غصے سے لبریز ہو گیا تھا۔

"کم ظرف کمینی عورت کی خاطر گھر چھوڑا کہاں گئی اب وہ ایسی عورتیں گھر کب بساتی ہیں۔ پیسے کے لیے آئی ہیں نہ ملے تو کیسا شوہر کہاں کا بچہ' بھاگ گئی ہو گی مگر ہماری سنتا کون ہے؟" بڑے بھیا ہتھیلی پر مکے مارتے رہے ٹہلتے رہے' شعلہ حلوہ لے آئی تھی آصف کھانا کھا چکا تھا منجھلے بھیا اچانک کھڑے ہو گئے انہوں نے آصف کے سر پر ہاتھ رکھ کر عجیب لہجے میں کہا۔

"اماں بی! میں اسے آپ کے پاس لے کر آیا تھا میرا تو کوئی ٹھکانا نہیں رہا اگر اسے آپ کے قدموں میں جگہ مل جائے تو میری فکر دور ہو جائے۔ اس کی ماں مر گئی ہے۔" ان کی آواز پھٹ گئی۔ مگر وہ بولے گئے۔ میری نوکری بھی چھوٹ گئی ہے میں اسے اماں کہاں لیے پھروں گا' آپ کا کام کاج ہی کر دیا کرے گا۔"

وہ ایک سانس میں بولتے رہے اس دوران وہ ایک انگلی اور انگوٹھے سے دامن کو مسلسل رگڑ رہے تھے گردن کی رگیں ابھر کر سرخ ہو گئیں جیسے وہ کسی ناقابل برداشت کرب میں مبتلا ہوں' اظہر کا دل بھر آیا بڑے بھیا پھر چیخنے لگے۔ اماں بی نے اپنی آنکھوں کو دوپٹے کے کونے سے مسلا پھر کسی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"چھوڑ جاؤ' پڑا رہے گا۔" وہ پھر پسی ہوئی دال کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

بڑے بھیا غراتے رہے "میری کوئی اہمیت نہیں اس گھر میں سب کچھ میری مرضی کے بغیر ہوتا ہے۔"

منجھلے بھیا نے ایک جھٹکے سے آصف کے ہاتھ سے اپنا دامن چھڑایا اور پیچھے کو لپک گئے۔ آصف تعجب اور سراسیمگی کے عالم میں انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ مگر اس نے [illegible] کے پیچھے قدم نہیں بڑھائے اظہر نے [illegible] انہیں [illegible] آصف سے [illegible] بھاگے تھے جیسے ناقابل برداشت درد نے تڑپا دیا تھا۔ ان کے محسوسات کی کرب انگیز لہریں اظہر کے دل کو چھید رہی تھیں اس نے انہیں کمر سے پکڑ لیا۔

"منجھلے بھیا! کچھ کھائے پیئے بغیر ہی جا رہے ہیں۔ کیا ملیں گے کبھی نہیں۔" وہ ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں پتھر میں دراڑیں سی پڑ رہی تھیں آنکھیں دکھ کے سمندر میں ڈوب گئی تھیں چہرہ اذیت کے پے در پے وار سے نیلا پڑ رہا تھا۔ یہ صحن میں بیٹھے منجھلے بھیا نہیں ان کا بھوت تھا۔ ابا لو کا وہ خوبصورت عالی شان پرشکوہ مجسمہ گوشت پوست کے انسان میں بدل گیا تھا۔ وہ بے کل سے ہو گئے دانت پر دانت جما کر جانے کون سی ٹیس پر قابو پایا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے

"نہیں پگلے! ملوں گا کیوں نہیں اور آیا کس لیے تھا" انہوں نے اسے گرم جوشی سے لپٹا لیا پھر الگ ہو کر کانپتی آواز میں بولے "اچھا خدا حافظ!"

اظہر نے جیب ٹٹول کر کچھ نوٹ نکالے اور جھجکتے ہوئے ان کی جیب میں ڈال دیے انہوں نے فوراً ہی اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں۔"

"آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا بھوکے جا رہے ہیں۔ نہیں منجھلے بھیا یہ تو رکھنے پڑیں گے آپ کو یہ میرے اپنے ہیں۔" وہ گردن سے انکار کرتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے مسلسل اسے تھپتھپا رہے تھے ان سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ "آپ کو لینا پڑے گا۔" اس نے ضد کی۔ "آخر اس گھر پر میرا بھی تو حق ہے۔"

وہ چیخ پڑے۔ "نہیں تمہارا کوئی حق نہیں۔" اچانک ان کی آنکھوں سے سمندر ابل پڑا۔ چہرہ آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ چہرے کی ایک ایک رگ کانپنے لگی۔ وہ رو رہے تھے۔ سارا ضبط' سارا تحمل رخصت ہو گیا تھا۔ اظہر کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا وہ بھی ان سے لپٹا رونے لگا منجھلے بھیا نے اسے الگ ہو کر آستین سے آنسو خشک کیے۔

"آپ نے کہا تھا آپ بھیک بھی مانگ لیتے ہیں" اس نے رو کر کہا۔ "بھیک سمجھ کر ہی لے لیں منجھلے بھیا۔"

درد کی اذیت ناک لہروں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ آنسوؤں میں ہی مسکرا پڑے۔ "نہیں یار کس کے لیے بھیک لوں۔ جس کے لیے مانگتا تھا اسے تو یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ہو سکے تو اسے پیٹ بھر کھانا....." انہوں نے اسے دھکا دے کر تقریباً گرا ہی دیا اور خود دوڑتے ہوئے پھاٹک کی طرف چل دیئے۔ سڑک پر ان کا تانگہ کھڑا تھا' اچک کر اس پر بیٹھے۔ تانگہ فوراً چل پڑا اور انہوں نے بازوؤں میں سر چھپا لیا۔ وہ یقیناً رو رہے تھے۔ سسک سسک کر رو رہے تھے۔ دل خراش سسکیاں اظہر بھی احساس کے کانوں سے سن رہا تھا۔ وہ بھی زمین پر بیٹھا روتا رہا۔ اندر بڑے بھیا مسلسل بڑبڑا رہے تھے۔

"پہلے کھانا منگوایا گیا پھر حلوہ لایا گیا۔ یہ کس لیے؟ میری ضد میں۔"

اماں جو اتنی دیر سے گم سم بیٹھی تھیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے۔ بولیں۔

"تو تم ہی کھا لو حلوہ' بجھا لو سینے کی آگ اگر بجھے تو۔ وہ تو بھوکا آیا تھا بھوکا ہی چلا گیا مگر تمہاری تو بھوک ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کیا کچھ کھاؤ گے؟ اور کتنا ہضم کرو گے۔؟" بڑے بھیا غضب ناک ہو کر کچھ کہنے والے تھے مگر بھابھی ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔ آصف اماں بی کے پلنگ پر پڑا سوتا رہا اس کے منہ پر مکھیاں بھنکتی رہیں۔

یہ تو اظہر کو معلوم تھا کہ منجھلے بھیا جب شہر پڑھنے گئے تھے تو انہوں نے ابا میاں کی مرضی کے بغیر شادی کر لی تھی پھر ابا نے انہیں عاق کر دیا۔ ان کا خرچ بند کر دیا اور انہوں نے کہیں نوکری کر لی۔ کبھی کبھی اڑتی ہوئی خبر ملتی کہ وہ بہت تکلیف میں ہیں۔ ان کی تعلیم یکسر چھٹ گئی ہے اور بیوی بیمار رہتی ہے اب جو آئے تو آصف کو لے کر۔ بیوی کی موت کی خبر لے کر۔ آصف ایک سال اماں بی کے پاس رہا۔ بھابھی کو وہ

ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اس کے کھانے سے انہیں سخت تکلیف ہوتی تھی مگر بڑے بھیا اب خاموش ہو گئے تھے شعلہ آصف کی خبر گیری کرتی مگر ایک دن وہ بھی مر گئی اور اب آصف کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اب زیادہ تر ابا میاں کے پاس زمین پر بیٹھا مٹی کے کھلونوں سے کھیلتا رہتا۔ چنگیر میں روٹی اور کٹوری میں دال سالن اس کے آگے رکھ دیا جاتا۔ وہ وہیں بیٹھ کر کھا جاتا اور بھابھی جل کر کہتیں۔

"کیسا فاقوں کا مارا ہے۔ پیٹ دیکھو کیسا مٹکا سا ہے۔" مگر وہ برابر سوکھتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے سوا اور کوئی قابل دید چیز نہیں تھی۔ ایک دن ایک آدمی منجھلے بھیا کا خط لے کر آیا۔ منجھلے بھیا نے آصف کو ملنے کے لیے بلایا تھا۔ کسی نے بھی اسے نہیں روکا، کپڑوں کی مختصر گٹھری لے کر وہ اس شخص کے ساتھ چلا آیا۔ ادھر بھابھی نے نہایت شدومد سے پیروں فقیروں کے ٹونے ٹوٹکے آزمانے شروع کر دیے۔ ہزار منت کے بعد شیما پیدا ہوئی۔ ننھی منی گڑیا۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ ہر روز اس کی نظر اتاری جاتی۔ بڑے بھیا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا مگر بھابھی کو جائیداد کے لیے وارث کی آرزو تھی۔ بیٹے کی خواہش بڑھ رہی تھی اور بیٹا جانے کہاں چھپا ہوا تھا۔ منجھلے بھیا پھر نہیں آئے، نہ ان کی کوئی خبر ملی۔ اماں بی کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان تکنے لگتیں اور منہ ہی منہ میں کچھ کہتیں۔ اظہر کے کان میں آصف کا لفظ پڑتا ضرور تھا مگر نہ وہ پوچھتا، نہ اماں بی پھر کچھ کہتیں۔

پھر عین شیما کی دوسری سالگرہ کے دن جب گھر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ صحن رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ تھا۔ خاندان کے بہت سے لوگ آ چکے تھے۔ ابا میاں نے شیما کے صدقے کے لیے پانچ سو روپے نکال کر بڑے بھیا کے ہاتھ میں دیے۔ "مستحق لوگوں میں تقسیم کرنا۔" انہوں نے کہا۔ دروازے پر میراثن حلق پھاڑ رہی تھی۔ بڑے بھیا اس کی طرف بڑھے، ابا میاں نے انہیں روکا۔ "نہیں یہ مستحق نہیں ہے۔" تب ہی دروازے پر کھڑی ایک بھکارن کو راستے سے ہٹا کر ایک بچہ اندر آ گیا۔ اظہر نے سب سے پہلے اسے دیکھا۔ "ارے آصف۔" وہ گیس کی لالٹین میں جتا ہوا تھا جو بار بار بھڑک رہی تھی۔ کسی نے آصف کو نہیں دیکھا شاید کسی نے پہچانا بھی نہیں۔

"تم یہاں۔" اظہر نے اس کے پاس جا کر کہا۔ "کس کے ساتھ آئے؟ ابا کہاں ہیں۔؟"

"مر گئے۔" اس نے لاتعلقی سے کہا۔ اظہر کے ہاتھ سے لالٹین صاف کرنے والا کپڑا گر گیا۔

"کیا... کیا؟ کب...؟" وہ بوکھلا گیا تھا۔

"صبح کو۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ بس زہر چڑھ گیا۔" اظہر آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گیا۔ یہ وہ بچہ تو نہیں تھا۔ دو برسوں میں کتنا بدل گیا تھا۔ بے حس منجمد بوڑھا چہرہ۔

"اماں بی۔!" وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ اماں بی شیما کے گلے میں سونے کی دو انگوٹھیوں والا گرہ دار کلاوہ پہنا رہی تھیں۔ ان کا ہاتھ کانپا اور کلاوہ ہاتھ سے گر گیا۔

"الٰہی خیر" بھابھی کے منہ سے نکلا۔ اظہر کی آواز وحشت ناک تھی۔

"منجھلے بھیا... مر گئے، آصف آیا ہے۔" اس نے پھر پوری طاقت سے چلا کر کہا۔ بھابھی شیما کو سینے سے لگا کر کچھ بدبدانے لگیں۔

"آج اس مبارک موقع پر کیسی نحوست ہو گئی۔ کم بخت کو اسی وقت آنا تھا۔" اظہر نے دوڑ کر ابا میاں کو سنایا۔

"ابا میاں منجھلے بھیا مر گئے۔" ابا میاں کا چہرہ فق ہو گیا۔ آنکھیں وحشت کے عالم میں پھٹ گئیں۔ انہوں نے پاس رکھی میز کا سہارا لیا اور پھٹی ہوئی آواز میں بولے۔ "خس کم جہاں پاک" بڑے بھیا گھبرائے ہوئے ہاتھ مل رہے تھے۔

"اب کیا ہوگا" باہر دیگیں کھنک رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگ کھانے کے انتظار میں پلنگوں پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ بچوں کی چیخ و پکار، عورتوں کی ہنسی، قہقہے مگر اس کے باوجود ہر طرف ایک سناٹا سا طاری تھا، منجمد سناٹا۔ ابا میاں اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ اظہر نے بھی ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر وہ آصف کو ساتھ لانے والے آدمیوں کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے ابا میاں سے ملاقات کی خواہش کی پھر انہیں پچھلی جانب سے ابا کے کمرے میں لے آیا۔ بڑے بھیا بھی وہیں موجود تھے۔ ابا میاں کے چہرے سے خون کی سرخی جانے کس نے چرا لی تھی۔

وہ انہیں منجھلے بھیا کی بیماری اور تکلیفوں کا بتانے لگے۔ ابا میاں ان سے سوال کرتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ "کس نے کیا سب انتظام...."

"ہم لوگوں نے... میں انور، عظیم، مل والے، محلے والے۔" اس آدمی نے سادگی سے کہا۔ "غریبوں کے بھی رشتہ دار ہوتے ہیں۔"

"ان لوگوں کے کھانے کا..." ابا میاں نے بڑے بھیا کی طرف دیکھ کر کہا۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ بڑے بھیا چلے جائیں۔ وہ لوگ کھڑے ہو گئے۔

"نہیں جی مہربانی۔ ہم جاتے ہیں۔"

بڑے بھیا نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر ان کی طرف بڑھائے۔ "یہ رکھ لو۔ تم نے بڑا احسان کیا ہے۔" وہ پیچھے ہٹ گئے۔

"احسان نہیں، ہم نے فرض ادا کیا ہے۔ ہم خیرات نہیں لیتے۔"

"یہ تو تمہارا انعام ہے۔" بڑے بھیا نے سمجھایا۔ "تم نے ہمارے بھائی کی اتنی مدد کی آخر وقت تک۔"

ان میں سے وہ جو ذرا بڑی عمر کا تھا۔ درد بھرے لہجے میں بولا۔

"اگر اتنی رقم اس کو آخر وقت میں مل جاتی تو وہ دو بوند دوا کے لیے ترستا ہوا نہ مرتا۔" دوسرے نے کہا۔ "ہم نے اس کی مدد اس لیے کی تھی کہ وہ ہم جیسا غریب تھا، مزدور تھا۔ ہم اس کے کام نہ آتے تو دوسرا تھا کون اس کا۔ یہ رقم اپنے پاس رکھیے کام آئے گی۔ ہم اتنے بے غیرت نہیں ہیں۔" وہ تینوں ان کے منہ پر سچائی کا طمانچہ لگا کر باہر آ گئے۔ انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

"بس آصف کا خیال رکھنا بابو صاحب۔!" ایک نے کہا۔ "خود فاقہ کر لیتا تھا، پر بچے کے لیے کہیں نہ کہیں سے کھانے کا انتظام کر لیتا تھا۔ کئی کئی دن مجوری نہیں ملتی تھی، بیمار جو تھا بیچارہ۔ مل سے بھی بیماری کے کارن نکالا گیا۔ دہاڑی کرنے لگا تھا۔"

"وہ بھی کبھی ملتی کبھی نہیں۔" دوسرے نے تاسف کے انداز میں کہا۔ "کئی دفعہ میں نے کہا میاں اپنے گھر چلا جا، تیرا باپ زندہ ہے، پیسے والا ہے۔ کیوں اپنی جان گنواتا ہے مگر بڑی عزت والا بندہ تھا۔"

"بس آصف کی پھکر کرے جاتا تھا۔ کئی دن ہوئے میں نے کہا میں اسے اس کے دادا کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔ سر ہلا کر بولا نہیں ابھی نہیں۔ ابھی میں نے اسے اچھی طرح دیکھا کہاں ہے۔ مجھے دیکھنے تو دو اور رو پڑا۔" اظہر بھی رو دیا۔

"اف منجھلے بھیا! تم نے کیوں اتنی اذیت سہی، کیوں اس قدر کٹھور ہو گئے تم۔ کسی پر تو بھروسہ کیا ہوتا۔ مجھ سے بھی غیرت؟" وہ لوگ بغیر کچھ کھائے چلے گئے۔ منجھلے بھیا بھی اس گھر سے بھوکے چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھی بھی انکار کر گئے۔ کہا کہ تمہارا بھائی مرتے وقت تین وقت کے فاقے سے تھا۔ ہمارا دل نہیں چاہتا کہ دعوت کا کھانا کھائیں۔

اظہر اندر آیا تو آصف دروازے پر ہی کھڑا تھا، بے حس منجمد۔ وہ اسے اندر لایا۔ منہ ہاتھ دھلا کر کھانا کھلایا۔ اماں بچوں کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ بڑی بھابھی عورتوں کی خاطرداری میں جتی ہوئی تھیں۔ بڑے بھیا نوکروں پر مسلسل بگڑ رہے تھے۔ انہیں کسی جگہ کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اظہر آصف کو لے کر اوپر آ گیا۔ ابا میاں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ جانتا تھا خود اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی۔ ابا میاں کرسی پر بیٹھے تھے۔ چاندنی میں ان کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر جب اظہر نے کہا۔

"ابا میاں آصف کو میں آپ کے پاس لے آیا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"اچھا کیا۔" اور سر دوسری طرف موڑ لیا۔ ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی برسات کی طرح بھاری

آصف ابامیاں کے پلنگ پر لیٹ کر سو بھی گیا مگر وہ دونوں باپ بیٹا رات دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ رات گزرتی رہی اور اداسی کی تہیں ان کے وجود پر اترتی رہیں۔ پرت در پرت غم کے اندھیرے فضا کو بوجھل کرتے رہے۔ جانے کیسا دکھ دے گئے تھے منجھلے بھیا۔ جب تک زندہ رہے کسی کو ان کی ضرورت نہ تھی۔ مرنے کے بعد سب کے دل پر ایسا چرکہ لگا گئے جس کی کسک سے سب ایک دم بے چین ہو گئے۔

ابامیاں ان کا ذکر کثرت سے کرنے لگے تھے۔ وہ ایسے کرتا تھا، یوں چلتا تھا، یہ چیز پسند کرتا تھا، وہ ناپسند کرتا تھا، کھانے پر کوئی چیز دیکھ کر بڑے چاؤ سے کہتے۔

"جمال کو یہ کھانا بہت پسند تھا۔" اور بڑے شوق سے کھانا شروع کر دیتے مگر بڑے بھیا اس کو ہاتھ بھی نہ لگاتے اور روکھی روٹی نگلتے رہتے۔ لگتا تھا ابامیاں کو اب بڑے بھیا کی اتنی پروا نہیں رہی۔ وہ انہیں جلانے کے لیے خاص طور پر منجھلے بھیا کی تعریفیں کرتے۔ ان کی خاموشی، سعادت مندی، شرافت، معصومیت آصف کو ان کے بچپن کے قصے سناتے۔ جانے کون سے پچھتاوے تھے کہ ابامیاں کی قابل رشک صحت دن بدن گرتی گئی۔ ان کی روح پر کوئی بوجھ تھا جو انہیں گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ آخر منجھلے بھیا کے چھ ماہ بعد وہ بھی ان سے جا ملے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے اماں بی سے کہا۔ "اسلم کچھ نہیں چھوڑے گا۔ کسی کو کچھ نہیں دے گا۔ میں نے تمہارے حصے کی زمین الگ کر دی ہے۔ مکان بھی تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ جس کو چاہے دے جانا۔ آصف کو خوش رکھنا۔"

پھر کتنے دن گزر گئے۔ آصف گھر میں نوکروں کی طرح پلتا رہا۔ بھابی کہتی تھیں۔ "جمال تو ابامیاں کی زندگی میں ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے آصف کو تو ان کے ترکے سے ملے گا نہیں۔ بھئی قانون آخر قانون ہے۔" اظہر کو یہ قانون بڑا بے رحم لگا لیکن قانون سے بڑھ کر انسان بڑا بے رحم تھا جو محبت میں بھی حصہ دار بنانا پسند نہیں کرتا۔

آصف کے حصے میں صرف نفرت آئی تھی۔ اظہر کو کوئی خاص کام نہ آتا تھا۔ بڑے بھیا نے اسے ایک ٹریکٹر لے دیا تھا۔ وہ اسی میں خوش تھا پھر انہوں نے تیز گام منگوا دیا۔ اظہر اور بھی احسان مند ہوا۔ چھوٹے چھوٹے احسان اسے ممنون کرتے رہے اور وہ بڑے بھیا کے ہر حکم پر سر جھکاتا چلا گیا۔ شیما بڑی ہو گئی تھی۔ وہ بھی ماں باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آصف پر حکم چلاتی، اسے ستاتی، جلاتی۔ آصف غرا کر اس کی طرف بڑھتا مگر چچی کی آواز پر فوراً بھیگی بلی بن کر کام میں لگ جاتا۔

وہ دن بھر کام کرتا اور ڈھیر سارا کھاتا۔ شیما کی امی اسے گھورتی رہتیں۔ "تو یہ پیٹ ہے کہ ہاتھی کی جھول، کسی طرح بھرتا ہی نہیں۔" وہ ہمیشہ فکر مند رہتیں کہ آصف کہیں شیما کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ ماں باپ کا بدلہ اس سے نہ لے۔ آصف گھر کے کاموں کے علاوہ بڑے چچا کے باہر کے کام بھی کرتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ دلچسپی چھپکلی مارنے سے تھی۔ جہاں کہیں اسے چھپکلی نظر آ جاتی وہ چپل لے کر اس کے پیچھے پڑ جاتا یا کبھی لکڑی سے مارتا۔ وہ زخمی ہو جاتی تو تڑپنے کا منظر دیکھ کر خوش ہوتا۔ شیما کو بھی گھن آتی۔

"کیا کرتے ہو اسے مار کیوں نہیں دیتے؟"

"مجھے مزہ آتا ہے۔" وہ سختی سے کہتا۔

"پتہ ہے گناہ ہوتا ہے۔" وہ سمجھاتی۔

"اس نے میرے ابا کو کاٹ لیا تھا۔ وہ مر گئے تھے۔ اسے گناہ نہیں ہوا۔؟"

"وہ کوئی اور چھپکلی ہو گی۔"

"یہ سب ایک نسل کی ہیں۔ میں سب کو اسی طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

"اونہہ سارے دنیا کی چھپکلیاں بھلا ختم کر سکتے ہو تم۔"

"اس گھر کی تو کر سکتا ہوں۔" وہ کہتا۔

اظہر نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا۔ اب اس پر بے پناہ بوجھ تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ گھر کے کام میں کولہو کے بیل کی طرح جت جاتا۔ رات کو کام ختم کر کے دادی کے پاس گھس جاتا۔ وہی اس کی پناہ گاہ تھی۔ شیما بھی دادی کے پاس لیٹی ہوتی۔ دادی، شیما کو کہانی سناتے سناتے سر اٹھا کر دیکھتیں اور کہتیں۔ "بس کر بچے کب تک بیٹھا رہے گا۔ سوئے گا نہیں۔!"

وہ کہتا۔ "دادی اسکول کا کام کر رہا ہوں۔ نہیں کروں گا تو ماسٹر ماریں گے۔ نام کاٹ دیں گے۔" کبھی کبھی کسی سوال کو سمجھنے کے لیے وہ کاپی پنسل لیے ادھر ادھر پھرتا رہتا۔ اظہر کا موڈ ہوتا تو بتا دیتا ورنہ ٹال جاتا۔ اس گھر میں آصف فالتو آدمی تھا۔ بھابی کو اس کا اسکول جانا ناگوار گزرتا تھا۔ وہ اظہر سے کئی دن خفا رہیں۔ انہوں نے کئی بار کہا کہ آخر وہ پڑھ لکھ کر کرے گا کیا؟ ایک دن [illegible] سے بھی انہوں نے کہا کہ۔

"آخر اسے اسکول سے اٹھا کیوں نہیں لیتے تم۔؟"

"رہنے دو تمہارا کیا نقصان ہے۔"

"واہ۔" وہ ہاتھ نچا کر بگڑیں۔ "نقصان کیسے نہیں۔ وہ تعلیم حاصل کرتا رہے ادھر سارا کام میری جان پر رکھا رہے۔ آخر میں بھی انسان ہوں آرام [illegible] ہوں۔"

"سارا کام اسکول سے آ کر تو کرتا ہے وہ۔" زمیندار کو بیوی کی ایک ہی بات میں اتفاق نہ تھا۔

"تو وہ پڑھ کر کرے گا کیا؟ وہی! جو اس کے باپ نے کیا۔ تمہیں کیا ملے گا۔"

"دنیا والوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے آخر وہ جمال کا بیٹا ہے۔"

"ہاں، ہاں۔ جمال کا بیٹا ہے۔ جانتی ہوں، یہ بھی جانتی ہوں جمال کس کا بیٹا تھا۔" وہ زور سے ہاتھ کا پنکھا جھل رہی تھیں۔ غصے اور نفرت سے ان کا چہرہ مکروہ ہو گیا تھا۔ "پڑھ لکھ کر تم کو نیچا دکھائے تو نام بدل دینا میرا۔" ایک دن کھانا کھاتے ہوئے اس نے اظہر سے کہا۔

"چھوٹے چچا! مجھے آج وہ ملے تھے جو شہر میں رہتے ہیں نا علیم الدین میاں۔" "علیم پھوپھا۔"

"وہ کہاں مل گئے۔" اظہر نے کنگھا کرتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا۔ "یہاں تو آئے نہیں۔"

"یہاں تھوڑی۔" وہ سانولے ہاتھ نچا کر ہنس دیا۔

"وہ تو اسٹیشن پر ملے تھے۔"

"تم وہاں کیا کرنے گئے تھے اسکول سے بھاگ کر۔؟" اس نے سختی سے پوچھا۔

"ارے نہیں۔" وہ گھبرا گیا۔

"مجھے تو بڑے چچا نے کام سے بھیجا تھا۔"

"اسٹیشن تو بہت دور ہے۔ کیا اکیلے گئے تھے۔ کام کیا تھا۔؟"

"وہ تانگے پر گیا تھا۔ جب گاڑی آئی تو جیسے بڑے چچا نے بتایا تھا۔ میں ایک ڈبے میں گھس گیا اور" اس نے ہاتھ منہ پر رکھ کر نقل کر کے بتایا۔ "آواز دی۔ کوئی وکیل صاحب ہیں۔ زمیندار کے مہمان مگر وہ اس ڈبے میں تھے نہیں۔ میں وکیل صاحب کو لینے ہی گیا تھا۔"

"وکیل، کون وکیل۔" اظہر چوکنا ہو گیا۔

"پتہ نہیں، بڑے چچا نے یہی کہا تھا کہ...... مگر وکیل صاحب اس ڈبے میں تھے نہیں۔ علیم پھوپھا تھے۔ وہ آ کر مجھ سے باتیں کرنے لگے پھر انہوں نے مجھے اپنے بیٹے اور بیٹی سے ملوایا۔ مجھے وکیل صاحب کو ڈھونڈنے کی جلدی تھی اس لیے چلنے لگا۔ انہوں نے مجھے ایک روپیہ دیا، پورا ایک روپیہ۔ یہ دیکھیں۔"

"پھر وکیل صاحب ملے یا نہیں۔؟" اظہر نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ اسے روپیہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"وہ تو مجھ سے پہلے ہی باہر آ کر تانگے پر بیٹھ چکے تھے چچا۔ میں اس روپے کا پستول لوں گا۔"

"اچھا!" اس نے بے خیالی میں کہا اور باہر چلا گیا۔ آصف نے دادی کو بھی روپیہ دکھایا۔

کچھ دیر بعد بڑے زمیندار اسلم نے اندر آ کر دیکھا نہ تاؤ۔ آصف کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ وہ چیختا رہا اور اپنا آپ بچاتا رہا پھر اظہر نے آ کر اسے چھڑایا۔

"اسے کیوں مار رہے ہیں۔ میری بات کا یہ تو جواب نہیں ہے۔"

اسلم زمیندار کے منہ سے مغلظات کا فوارہ سا پھوٹ رہا تھا۔ اماں کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔

"دو بھائیوں کے بیچ میں تفرقہ ڈلواتا ہے، الو کا پٹھا۔"

اماں نے پھر پوچھا۔ "آخر بات کیا ہوئی۔"

انہوں نے کہا۔ "دیکھو اماں، صاف بات ہے۔ یہ زمین جائیداد میں نے اپنے خون سے سینچی ہے۔ دن رات محنت کی ہے تب زمیندار بنا ہوں۔ بے شک زمین ابا کی تھی مگر اسے زرخیز بنانے میں، بڑھانے میں، میں نے خون پسینہ ایک کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ دیکھ بھال اور ترقی کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ دماغ لڑانا پڑتا ہے، دل جلانا پڑتا ہے۔ تب پیسہ ہاتھ میں آتا ہے اور زمین سونا اگلتی ہے۔ میں نے آصف کو ایک کام سے بھیجا تھا۔ ہر بات تو میں اظہر کو نہیں بتاتا نا۔ اسے کیا پتہ میں اندر ہی اندر کتنی ترکیبیں لڑاتا ہوں مگر آصف نے جانے کیا کہہ دیا کہ وہ مجھ سے جواب طلبی کرنے آ پہنچا۔ آج پتہ چلا کہ آستین کا سانپ کسے کہتے ہیں۔"

"میں نے صرف پوچھا تھا کہ وکیل کو کیوں بلایا ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ کیا کام لیا جائے گا۔" اظہر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"بچے ہو میاں۔ جاؤ اپنے گھوڑے سے کھیلو۔ زمینداری کے داؤ پیچ جس دن سیکھ جاؤ گے تمہیں خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" اسلم زمیندار کا لہجہ بھی کڑوا تھا۔

"آپ مجھے سیکھنے ہی نہیں دیں گے۔ کھلونے دے کر بہلاتے رہتے ہیں مگر میں منجھلے بھیا کی طرح خاموش نہیں رہوں گا۔ مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔ آپ مجھے جواب دینے کے بجائے کمزور پر طاقت آزمانے آ گئے۔" اسلم زمیندار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر دونوں بھائی آگے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔ آصف زمین پر پڑا سسکتا رہا مگر دیوار پر بیٹھی چھپکلی کی موت آ گئی تھی پھر کئی دن فضا کشیدہ رہی۔ اسلم زمیندار اظہر کے سامنے آنے سے کتراتے رہے۔ دو تین دن بعد شیما کے کچھ روپے کھو گئے۔ اس نے طاق پر رکھے تھے۔ نہیں ملے تو آصف پر شبہ کیا گیا۔ وہ اس دن علیم چچا کے دیے ہوئے روپے سے پلاسٹک کا پستول لے کر آیا تھا۔ چچی نے دیکھتے ہی پوچھا تھا کہ

"کہاں سے آیا یہ۔؟" وہ جواب دیے بغیر دادی کے کمرے میں بھاگ آیا مگر جوں ہی شیما کے روپے غائب پائے گئے وہ دھر لیا گیا۔ اسے صفائی کا موقعہ دیے بغیر دادی کے کمرے میں خوب پیٹا۔ ساتھ ہی چچی کی کمنٹری بھی جاری رہی۔

"ڈاکو بنے گا۔ غضب خدا کا گھر سے ننھی بہن کے پیسے چرا لیے۔ جانے کتنے چراتا ہوگا۔ میری عادت رکھ کر بھول جانے کی ہے۔ یہ کیا خبر تھی گھر میں ڈاکو پل رہا ہے۔ کھائے بھی ہمارا، چرائے بھی ہمارا۔ باپ سے دو جوتے آگے رہے گا۔"

دادی قہر آلود نظروں سے انہیں گھورتی ہوئی اسلم زمیندار کے سامنے آ گئیں۔ ان کا آصف پر اٹھا ہاتھ رک گیا۔ انہوں نے اس کا پلاسٹک کا پستول اس سے چھین کر زمین پر پٹخ ڈالا اور جوتے کی ایڑی سے مسلسل کچل کر چور چور کر دیا۔ شیما کو بھی دکھ ہوا۔ ہائے کتنا خوب صورت تھا مگر آصف جو اب تک خاموشی سے پٹ رہا تھا پاگلوں کی طرح چیخ پڑا۔ اس نے پلٹ کر بڑے چچا کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ "میرا پستول! میرا پستول۔" وہ چلا رہا تھا۔ شیما کی امی فاتحانہ غرور سے اس کرچی کرچی پلاسٹک کو دیکھ رہی تھیں جو کچھ دیر پہلے آصف کے ہاتھ میں پستول کی صورت تھا۔ وہ اپنے میاں کو پکڑ کر باہر لے گئیں۔ آصف زمین پر گرا مچلتا رہا۔ دادی خاموش پتھر کے بت کی طرح بیٹھی رہیں۔ رات کو انہوں نے اظہر کو رپورٹ دی۔

"علیم کے دیے روپے سے پستول خرید لایا تھا نگوڑا۔ شیما کے پیسے کھو گئے تھے۔ بہو نے کہا آصف نے چوری کیے ہیں۔ جان کا دشمن ہو رہا ہے اسلم۔"

"اماں، تم خاموش کیوں رہتی ہو۔ اسے مار سے بچا نہیں سکتیں تو جھوٹے الزام سے تو بچا لیا کرو۔" اظہر نے کڑھ کر کہا۔ "صبح شیما نے مجھے گڑیا لانے کے لیے پیسے دیے تھے۔"

"میں پہلے ہی جانتی تھی وہ چور نہیں مگر بیٹا کس کس کی زبان روکوں۔ کس کس کا مقابلہ کروں۔" اسی وقت سوتے میں آصف نے کروٹ لی اور بڑبڑایا۔

"پستول، میرا پستول۔"

"دیکھا، سوتے میں بھی اسی کی رٹ ہے۔ جب آیا تھا تب بھی سوتے میں چھپکلی پکارتا تھا۔ جانے کس نے کہہ دیا تھا کہ اس کے باپ کو چھپکلی نے کاٹ لیا۔"

اماں بی کبھی منجھلے بھیا کے مرنے کا ذکر نہیں کرتی تھیں۔ وہ یوں باتیں کرتیں گویا انہیں ان کی کچھ خبر نہیں اور جیسے وہ زندہ ہوں۔ اظہر تاسف بھری نظروں سے آصف کو دیکھتا رہا۔ واقعی بڑے بھیا نے اسے بہت بے دردی سے مارا تھا۔ شاید وہ سچ مچ اس کے دشمن تھے۔ صبح اس نے شیما کے سامنے گڑیا لے جا کر رکھی تو شیما کو جلال آ گیا۔ وہ چیخ پڑی۔

"ہائے، روپے تو مجھ سے چچا کو دیے تھے۔" اسے آصف کو بے قصور مارے جانے کا بہت دکھ ہوا۔ پتہ نہیں اماں، ابا کو افسوس ہوا یا نہیں۔ آصف کا اسکول چھٹ گیا۔ سارے کھیل بھی بند تھے۔ وہ دن بھر گھر کے کام کرتا یا ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھپکلیاں مارا کرتا۔ نجانے کب گھر اور زمینداری کے لوازمات بھی کے ڈھیر پر چھپکلی ہو یا اجاڑ بھی الٹے نیچے لکڑی کے انبار کے پیچھے یا بیلوں کے اندر کے کھنڈروں میں ان کی افزائش ہوتی رہتی اور آصف اپنے باپ کے معروضہ قاتل کی پوری نسل سے انتقام لینے پر مستعد چھڑی لیے رہتا۔ وہ شیما کو مردہ چھپکلی سے ڈراتا۔ لکڑی میں پرو کر اس کے پیچھے لپکتا۔ وہ چیخیں مارتی اپنی امی سے شکایت کرتی، وہ کہتیں۔

"پاگل ہو گیا ہے۔ مت بات کیا کر اس سے۔"

اصل میں اب وہ پھر سے پیروں فقیروں کی ٹوہ میں رہنے لگی تھیں جو انہیں کم از کم ایک عدد بیٹا تو دلوا ہی دے۔ اس مقصد کے لیے ان کے اردگرد قسم قسم کی عورتیں اپنے تجربوں کے نچوڑ کے ساتھ موجود رہتیں۔ تعویز، گنڈے، ٹونے ٹوٹکے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھیں۔

ایک دن شہر سے آتے ہوئے اظہر پر کسی نے پستول سے گولی چلائی۔ اتفاق سے اس دن سفر میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ اظہر کے ساتھ ہی آ رہے تھے۔ انہیں اگلے گاؤں جانا تھا اور اظہر نے ان سے کہا تھا کہ وہ انہیں اپنے تانگے پر پہنچوا دے گا۔ ان صاحب نے پہلی گولی کے چلتے ہی اظہر کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور خود بھی گر گئے۔ دوسری گولی زمین پر آ کر لگی۔ کچھ مٹی اڑی اور پھر گھوڑا دوڑنے کی آواز آئی۔ گولی اظہر کے بازو میں لگی تھی مگر زخم بہت گہرا نہ تھا۔ اس کے ہم سفر نے اسے پہلے اسپتال پہنچایا۔ آپریشن فوراً ہوا اور ڈریسنگ کے بعد وہ اسے گھر لے آئے۔

اظہر پر غشی طاری تھی مگر وہ جلد سنبھل گیا۔ خوف زدہ آصف نے اس کے سوالوں کے جواب میں بتایا کہ اسے یہ ضرور معلوم ہے کہ صبح پانچ بجے جب وہ بھینس کا دودھ دوہنے اٹھا تھا تو تیز گام اپنی جگہ پر نہیں تھا اور رات میں ایک انجان شخص بھی ضرور آیا تھا جس نے بڑے چچا سے کچھ رازدارانہ بات کی اور پھر جانے کدھر چلا گیا۔ اس وقت بھی تیز گام نہیں تھا۔ آصف نے اسے جاتے نہیں دیکھا البتہ رات کو تیز گام کی تیز ہنہناہٹ سن کر وہ باہر آیا تو وہ اپنی جگہ پر بندھا ہوا تھا مگر اس کا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا جیسے وہ لمبی مسافت طے کر کے آیا ہو یا بہت تیز دوڑتا ہوا آیا ہو۔ پتہ نہیں اظہر کے سوالوں سے آصف کیا سمجھا یا اظہر کے شبہات نے اسے کیا سمجھایا مگر وہ بہت چپ چپ ہو گیا۔ اس دن بھی جب وہ تیز گام کو سہلا سہلا کر پیار کر رہا تھا اس سے یہی پوچھ رہا تھا۔

"تیز گام کہاں غائب ہو گیا تھا تو۔ کس کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر لے گیا تھا بول۔!" جانے کس طرح تیز گام بے قابو ہو گیا اور بھاگا ناک کی سیدھ میں۔ شیما اندر سے باہر آ رہی تھی اس کے ہاتھ میں کٹے ہوئے تربوز کا تھال تھا۔ وہ خطرے کو بروقت بھانپ نہ سکی۔ آصف کی چیخ اور تیز گام کی سرسراتی ہوئی سانسیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ وہ تربوز کے تھال سمیت زمین پر گر گئی۔ تیز گام تربوز پر سے پھسلا دھڑام سے گرا اور فوراً ہی لوٹ پوٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنی دیر میں نذیراں، شمشاد، آصف اور سب دوڑ پڑے۔ بڑے چچا شیما کی پے در پے چیخوں کو سن کر دوڑے آئے۔ شیما زمین پر گری ہوئی چلا رہی تھی۔ آصف تیز گام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے سہلا رہا تھا۔ بڑے چچا نے آصف کا کان پکڑا

اور کھینچتے ہوئے اندر صحن میں لائے۔ شیما نذیراں کی گود میں تھی اور برابر رو رہی تھی۔ کسی نے اندر خبر کر دی کہ آصف نے شیما پر گھوڑا چڑھا دیا۔ چچی بین کرکے رو رہی تھیں۔

"اسے کچلنا چاہتا تھا تو بتا۔" چچی روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "تم کو کچھ نظر نہیں آتا۔"

چچا نے ایک لکڑی اٹھا لی۔ ان کے غصے پر چچی کے بین اور آنسو نمک پاشی کر رہے تھے۔

"بول اسے مارنا چاہتا تھا۔" ایک لکڑی اس کی کمر پر پڑی۔ آصف درد سے دوہرا ہو گیا۔

"ہاں اب بتا۔ مارنا چاہتا تھا شیما کو۔" یہ لکڑی ٹانگوں پر پڑی۔ آصف گر پڑا۔

"ارے ظالم کیا جان لے گا آج۔" دادی اندر سے چلاتی ہوئی باہر آ رہی تھیں۔

"ہاں اس نے میری بچی کی جان لینی چاہی تھی اس لیے آج میں بھی اسے چھوڑوں گا نہیں۔" بڑے چچا کانپ رہے تھے۔

"اچھا! قسم ہے تجھے تیرے اصل کی۔" دادی غصے سے کانپ رہی تھیں۔ ان کی آواز لرز رہی تھی۔ "اگر تو اپنے باپ سے ہے آج اسے زندہ نہ چھوڑنا کم بخت اس کے باپ کو مار کر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔" بڑے چچا نے لکڑی پھینک دی اور پیچھے ہٹ گئے۔ چچی جو شیما کو لیے کھڑی تھیں اسے چھوڑ کر لپکیں اور آصف کے منہ پر طمانچوں کی بارش کر دی۔ نہ ناک دیکھا نہ کان۔ ناخنوں سے اس کا منہ نوچ لیا اور مکوں سے مار مار کر اسے ادھ موا کر دیا۔ تب ہی باہر سے اظہر نے للکارا۔

"بس بھابھی۔" وہ ابھی آیا تھا۔ اس نے اپنی بھابھی کا ہاتھ سختی سے پکڑ کر انہیں دھکا دیا۔ وہ ڈر گئیں۔ بڑے چچا آصف کو گھسیٹتے ہوئے اندر کمرے میں لائے، پلنگ پر پھینک کر اپنی ماں سے بولے۔

"سنبھالیے اپنے لاڈلے کو۔ لگتا ہے کہ صرف اسی سے سارا رشتہ ہے، ہم غیر ہیں۔ میری بچی کو کچھ ہو جاتا تو۔!"

دادی نے زخموں سے چور آصف کو دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"تم جانتے ہو رشتہ میرا ہے یا تمہارا۔؟"

"سنپولیا۔" اسلم زمیندار دانت پیس کر بولے۔ "سانپ کی اولاد۔"

"سانپ کو تو تم نے نگل لیا۔ تمہارے زہر نے اسے چھوڑا کب، اب کب تک اس کی روح کو ڈسو گے۔" دادی بھی کانپ رہی تھیں۔

"میری بچی کو کچھ ہو جاتا تو۔"

"اللہ نے اس کے نصیب میں جو لکھا ہے وہی ہوتا ہے۔ نہ زیادہ نہ کم۔" رات بڑے قہر کی تھی۔ آصف کی ٹانگیں اور کمر سوج گئی تھیں۔ منہ نیلا اور زخمی تھا وہ کراہتا تو دادی کے منہ سے بددعائیں نکلتیں۔

"الٰہی! اسلم تو بے گناہوں کے صبر سمیٹے۔ اپنی بچی کے ہاتھوں سزا کو پہنچے۔ جس کے کارن اس بے قصور کو دکھ دیا ہے۔" وہ رات بھر اس کے جسم کی سنکائی کرتی رہیں۔ اظہر نے انہیں پوری رات آصف کے پاس بٹھائے رکھا۔ صبح اس نے پوچھا۔

"اماں بی! بڑے بھیا نے کیا کہا تھا، رشتہ میرا ہے یا تمہارا! اس کا کیا مطلب؟" اماں نے مڑ کر اسے غور سے دیکھا۔

"تو اظہر تجھے دنیا کی کچھ خبر نہیں۔ کہیں کوئی بڑا نقصان نہ اٹھا بیٹھے۔ ساری دنیا جو بات جانتی ہے تجھے اس کی بھی خبر نہیں۔" وہ ٹالتی رہیں۔ آخر میں انہوں نے بتایا۔ "منجھلے بھیا ان کے بیٹے نہیں تھے۔ ابا میاں نے اپنے ایک مزارع کی بیٹی کے حسن و جمال پر عاشق ہو کر شادی کر لی تھی۔ وہ تھے بہت حسین اور حسن پرست۔ اماں بی کو انہوں نے یہ راز بتا دیا اور وہ یہ سوچ کر چپ ہو گئیں کہ شادی ہی تو کی ہے بھگا کر تو نہیں لائے۔ کسی بری عورت سے آشنائی نہیں کی مگر جب وہ جمال کو لے کر آئے اور اماں بی کی مرضی سے اس کی ماں کو بھی لے آئے تو ان کی ماں، بہن نے سخت اعتراض کیا اور اس لڑکی کا رہنا دوبھر کر دیا۔ وہ ان کے مزارع کی لڑکی تھی۔ غربت وہ گناہ تھا جس کی پاداش میں وہ کئی ماہ ظلم سہتی رہی۔ آخر کار بچے کو چھوڑ کر جانے کہاں نکل گئی۔ جمال شروع میں بہت بیمار رہتا تھا۔ اماں بی ہی اس کی تیمارداری اور پرورش کرتی رہیں۔ دادی پھوپھی نے اسلم کو بھی اس سے برگشتہ کر دیا تھا۔ وہ بڑا ہوا تو اسلم اس سے باقاعدہ دشمنی پر آمادہ ہو گیا۔ آخر کار جمال کو تعلیم کے لیے شہر کے ہاسٹل میں داخل کر دیا گیا۔ جب وہ چھٹی میں گھر آتا تو اسلم کے طعنے سنتا اور ذلت آمیز فقرے دادی پھوپھی سے ملتے۔ وہ اماں بی کی حمایت کے باوجود گھر سے باہر رہنے لگا۔ مزارعوں مزدوروں کے بچوں سے دوستی کر لی اور نچلے طبقے کے لوگوں سے مراسم بڑھتے رہے۔ وہاں اس کی عزت کی جاتی تھی، اسے چاہا جاتا تھا پھر شہر میں ہی کسی لڑکی کے معاشقے کی خبر اسلم نے بڑھا چڑھا کر باپ کو بتائی۔ باپ نے جمال کو سمجھایا کہ وہ اپنے ارادے سے دست بردار ہو جائے۔ وہ لڑکی کسی مزدور کی بیٹی تھی۔ جمال نے کہا۔ وہ شادی اسی سے کرے گا۔ باپ نے پھر سمجھایا تو اس نے کہا کہ "آپ ایک مزارع کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں تو میں مزدور کی بیٹی سے کیوں نہیں کر سکتا۔" اس بات پر باپ آگ بگولہ ہو گئے۔ اسلم نے خوب باپ کے کان بھرے۔ آخر جمال کی ضد نے یہ دن دکھایا کہ باپ نے جائیداد سے عاق کر دیا۔ خرچ بند کر دیا۔ جمال نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ تعلق بظاہر بالکل ختم ہو گیا مگر میں جانتی ہوں وہ باپ کا پیارا بیٹا تھا۔ وہ آخر وقت تک اسے بھول نہیں سکے اور پچھتاووں نے ان کی جان لے لی۔ اب اسلم آصف سے بدلہ لے رہا ہے۔ سزا دے رہا ہے جمال کو پالنے کی سزا۔ آصف کو پناہ دینے کی سزا۔ باپ کو جمال سے نفرت دلانے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر وہ آخر وقت تک نفرت نہ کر سکے۔ ہاں، اسلم کے سامنے بے بس تھے کیونکہ ساری زمینداری اس کے حوالے کر چکے تھے۔"

"مگر منجھلے بھیا ہمارے بھائی تو تھے اماں۔!"

"ہاں کیوں نہیں۔ میں نے اسے جنم نہیں دیا مگر پالا تو ہے۔ ایسا بیٹا تو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔" پھر وہ ان کے صبر و برداشت، حلیمی، مروت، ایثار، سعادت مندی کی کتنی ہی باتیں بتاتی رہیں۔

"جب وہ اتنے اچھے تھے تو بڑے بھیا کیوں ان سے جلتے تھے۔؟"

"خود میں کمی ہو تو انسان بہتر آدمی کو برداشت نہیں کرتا بیٹے! اسلم کو بچپن ہی سے جمال سے نفرت سکھائی گئی۔ حسد نے اس کی تمام خوبیوں کو مٹا دیا۔ اوپر سے دادی نے اس کے دماغ میں سوتیلے پن کے بیج بو دیے۔ جمال سے پہلے اسلم تنہا پوری جائیداد کا حصہ دار تھا مگر بعد میں ایک غریب بے نام خاندان کی لڑکی کا بیٹا بھی برابری کا حصہ دار بن گیا۔ دادی کو بھی یہ پیوند گوارا نہ تھا۔ اپنی ساری نفرت وہ اسلم کو سونپ گئیں جو آج تک جمال کے بعد آصف پر آ رہا ہے۔ اب اسے اپنی بیٹی کے فائدے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔"

صبح ہو رہی تھی، اماں بی فجر کی نماز پڑھنے لگیں۔ اظہر سوچتا رہا۔ غور کرتا رہا۔ صبح دن چڑھے شیما کے لیے ڈاکٹر بلایا گیا جو بڑی دیر تک یقین دلاتا رہا کہ شیما کے اندرونی چوٹ نہیں آئی وہ محض ڈر گئی ہے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد اظہر آصف کو سہارا دے کر برآمدے میں لے آیا۔ اس نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔ بڑے پیار اور نرمی سے اس نے کہا۔

"کتنا خوب صورت چہرہ ہے۔" آصف جو چچا چچی سے خوفزدہ تھا انہیں ترچھی نظروں سے دیکھنے لگا۔ شیما کو اس کے مضحکہ خیز چہرے اور خوف زدہ نظروں کو دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ وہ باقاعدہ بیمار بنا کر لٹا دی گئی تھی۔ آصف کا چہرہ جگہ جگہ سے نیلا اور زخمی تھا۔

"یہ آنکھیں۔!" اظہر نے اسے گود میں لے کر چپکے سے کہا۔ "منجھلے بھیا کو بہت پیاری ہوں گی۔" اس نے جھک کر آصف کی آنکھوں کو چوم لیا۔ "یہ گال وہ ان کو ایسے پیار کرتے ہوں گے۔" اس نے آصف کے زخمی چہرے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اماں بی سکتے کے عالم میں بیٹھی اسے دیکھتی رہیں۔ ان کی پلکیں نم ہوتی گئیں۔

"یہ ہونٹ، انہیں اس طرح چومتے ہوں گے منجھلے بھیا۔" اظہر نے بھاری آواز میں کہا اور جھک کر ہونٹ چوم لیے۔ بڑے بھیا سامنے بیٹھے تیوری چڑھائے الجھے الجھے انداز میں اظہر کو دیکھ رہے تھے۔

اظہر نے بے تاب ہو کر اسے سینے سے لپٹا لیا اور چیخ پڑا۔

"منجھلے بھیا! تم اتنی جلدی چلے گئے اور ہمیں اس جنم سے نکلنے کی کوئی تدبیر بھی نہ بتائی۔" وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔ ساتھ ہی آصف گھٹی گھٹی آواز میں ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

اس دن کسی نے اچھی طرح کھانا نہیں کھایا۔ کسی نے کسی سے بات نہیں کی۔ آصف نے سوتی تاگوں سے گھسٹ گھسٹ کر دو چھپکلیاں ماریں اور ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھتا رہا۔ اور اس دن دو عجیب باتیں ہوئیں۔ اظہر نے بڑے بھیا سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا۔ بڑے بھیا پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسے نااہلی پر سرزنش کرتے رہے۔

"برباد کر دو گے۔ آ آ گیا ہے ٹریکٹر چلا لینے سے ہی زمین سونا نہیں اگلتی۔ عقل بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔" سارا دن دونوں بھائیوں میں جھڑپ ہوتی رہی۔ دوسری بات شام کو وقوع پذیر ہوئی۔ شیما کی چیخ پر سب اس کی طرف دوڑے۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی تڑپ رہی تھی اور آصف سامنے حیران کھڑا تھا۔ شیما کی اماں چیختی ہوئی بیٹی کی طرف بڑھیں۔ آصف دادی کو صفائی دینے لگا کہ اس نے جان کر نہیں مارا۔ وہ تو چھپکلی پر نشانہ لگا رہا تھا۔ بیچ میں شیما آ گئی۔ چچی کلیجہ پھاڑ کر رو رہی تھیں۔ بین کر رہی تھیں۔ شیما کی آنکھ کے اوپر پتھر لگا تھا، ماتھے پر خون بہہ رہا تھا، آنکھ سوج گئی تھی۔ دادی نے اسے دیکھا اور پھر آصف کو کھینچتی ہوئی کونے میں لے گئیں۔ جہاں چولہے میں جلانے والی لکڑیاں رکھی تھیں۔

انہوں نے ایک موٹی لکڑی اٹھائی اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ "کم بخت دشمن ہے اس کا۔" مگر وہ جلد تھک کر ہانپنے لگیں۔ لکڑی انہوں نے پھینک دی اور رونے لگیں۔

"کرم تو پھوٹے ہی تھے۔ دیدے بھی پھوٹ گئے تھے کہ اتنی بڑی لڑکی نظر نہ آئی۔" چچی نے شیما کو اٹھا لے جانے میں دیر نہ کی اور باہر بیٹھک میں بڑے چچا کو خبر کرنے میں دیر نہ لگائی مگر وہ اس قدر مصروف تھے کہ اندر نہ آ سکے۔ کہلا دیا کہ دوا لگا دو۔ چچی سینہ پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ میاں کی لاپروائی اپنی بدقسمتی کے بیان کے علاوہ آصف کو کوسنے لگیں مگر بڑے چچا اظہر کے مطالبے کے بعد اتنے پریشان تھے اور رجسٹروں کی دیکھ بھال میں اس قدر منہمک تھے کہ رات تک نہیں آ سکے۔

صبح جب سزا کے لیے آصف کی ڈھنڈیا مچی تو وہ گھر میں نہیں تھا، اسکول میں نہیں گلی محلے میں نہیں، کسی کے گھر بھی نہیں۔ شیما کے علاج اور آصف کی تلاش میں کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ اظہر کی جائیداد کی علیحدگی کا مسئلہ ٹل گیا۔

شیما کی آنکھ کا زخم کئی ماہ میں ٹھیک ہوا مگر اپنا نشان چھوڑ گیا پھر اظہر کی شادی ہو گئی۔ اسلم اور ان کی بیوی کو یہ رشتہ پسند نہ تھا مگر اظہر کو ضد ہو گئی۔ برسوں پہلے جب اظہر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور ایک ہم سفر اس کے ساتھ آئے تھے ان کو کچھ ایسی محبت ہو گئی کہ وہ بعد میں بھی ایک دو دفعہ ملنے آئے اور اظہر کو اپنے گھر میں مدعو کیا پھر وہ اپنی بیوی اور لڑکی کو بھی گاؤں لے آئے۔ اماں بی کو بھی لڑکی پسند آئی۔ صبح کی پو پھٹنے جیسی خوب صورت اور مہذب تھی۔

بڑے بھیا کو بس ایک اعتراض تھا کہ لڑکی کے باپ بہت چالاک تھے اور اظہر کو یہ بات بہت پسند تھی۔ اس نے کہا۔ "میں یہی چاہتا تھا۔" بھابھی کو بہو پسند نہ آئی۔ انہوں نے از سر نو پیروں، فقیروں کے تعویذ لینے شروع کر دیے۔ مزاروں، قبرستانوں کے چکر لگنے لگے۔ قبر کھود کر مٹی تک لے آئیں۔ جانے کیا کیا ٹونے کیے۔ ہزار دعائیں مانگیں۔

"مولا بس ایک بیٹے سے میری گود بھر دے۔" مگر مولا بے نیاز تھا۔ انہیں فکر بھی کہ اظہر کے بیٹا ہو جائے گا اور وہ حسرت میں تڑپتی رہیں گی مگر ان کا بیٹا کسی آن صورت نہ دکھاتا تھا البتہ اظہر کی بیوی کو چکر آنے لگے، کھانا پینا چھوٹ گیا پھر وہ آرام کے لیے اپنے میکے چلی گئی اور شیما کی امی نہایت جوش اور سرگرمی سے علاج معالجے کی طرف رجوع ہو گئیں۔ ٹونے ٹوٹکے بھی جاری رہے۔

ان ہی دنوں اظہر پر پھر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اماں بی سکتے کے عالم میں اسلم زمیندار کو تکتی رہیں۔ وہ منہ پھیر کر چلے گئے۔ اظہر گھر آیا تو خون زیادہ بہہ جانے سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کے سسر علاج کے لیے اسے شہر لے گئے اور پھر وہ واپس نہ آیا اس نے شہر میں ملازمت کر لی۔ دونوں میاں، بیوی نے اماں بی کی بہت خوشامد کی کہ وہ ان کے ساتھ شہر چل کر رہیں مگر اماں بی نے انکار کر دیا۔ جس گھر میں ان کی لہلہاتی جوانی گزری اور سرسبز بڑھاپا گزر رہا تھا اسے جیتے جی چھوڑنا ان کے بس میں نہ تھا۔ کئی سال گزر گئے انہوں نے پھر زمین جائیداد کا مطالبہ نہ کیا۔ اسلم زمیندار اپنے جوڑ توڑ میں لگے رہے۔

شیما اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ لاڈ پیار میں وہ بہت ضدی ہو گئی تھی۔ ماں، باپ اس کی ہر بات مان کر ہر خواہش پوری کر کے نہال ہو جاتے البتہ شیما کی امی کو اس سے گلہ تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت دادی کے پاس کیوں گزارتی ہے جتنا وقت وہ دادی کے پاس رہتی اس کی قینچی جیسی زبان چلتی رہتی۔ دادی کی ہر بات وہ مان لیا کرتی تھی۔ انہیں یہ بھی صدمہ تھا کہ وہ بڑے سارے کانٹے تو خود بخود نکل گئے مگر شیما کی دادی کی آنکھ کی بینائی تک کم نہ ہوئی۔ اس عمر میں لوگ اندھے ہو جاتے ہیں مگر ان بڑی بی کی بینائی تیز سے اور تیز ہوتی جاتی تھی۔ ادھر شیما ان کے گلے کا ہار تھی۔ جانے دادی، پوتی میں کیا راز تھی۔

"بڈھی جانے کی بڑھی، کیا قیامت کے بوریے سمیٹے گی۔" اور پھر سال گزرنے لگے۔ خزاں بہار، سردی گرمی، برسات، شیما نے جوان ہو کر کیا روپ نکالا کہ بقول دادی کے سانس رکنے لگتا ہے بھرپور نظر نہیں ڈالی جاتی، رنگ تو تازہ گلاب جیسا تھا ہی اب اس میں صبح کے نور کی چمک شامل ہو گئی۔ شربتی آنکھیں پلکوں کے بوجھ سے جھکی رہتیں۔ سنہری چمک دار بال شانوں پر بکھرائے مدھ ماتی چال چلتی تو جیسے ہر سو سناٹا سا چھا جاتا۔ مسکراتی تو سفید چھوٹے دانت موتیوں کی طرح دمک اٹھتے۔ دادی ہر طرف نظر سے بچانے کے لیے پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتیں۔

نذیراں زمین پر چاول پھیلائے صاف کر رہی تھی۔ شیما، دادی کے پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اماں نے کہا۔ "بھئی ذرا چاول چنوا لو، نذیراں کو بہت کام ہے۔" وہ لاپروائی سے ٹانگیں ہلاتی رہی۔

"کتنی دفعہ منع کیا ہے ٹانگیں ہلانا برا ہوتا ہے، نحوست ہوتی ہے۔" اماں خفا ہو کر بولیں۔ "چلو آؤ، چاول چنوا لو۔ لڑکیوں کو کچھ کام بھی کرنا چاہیے۔"

"کیوں کریں کام۔" وہ تنک کر بولی۔ "نوکر کم ہیں کیا؟ ہم کوئی آصف ہیں جو گھر کا کام کریں۔"

دادی نے، اماں نے اور نذیراں نے ایک ساتھ تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے آصف اب تک یاد ہے۔ اس گھر میں کبھی اس کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے دادی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ اماں نے سوچا اور دادی سوچ رہی تھیں۔ "آج آصف کا نام آیا تو کیسے پھولوں کی مہک سی آئی۔ الٰہی جہاں ہو، خوش ہو۔" ان کو پچھتاوا تھا کہ انہوں نے اسے لکڑی سے مارا تھا تب ہی وہ بھاگ گیا۔

"ارے یہ کون۔!" نذیراں نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر دیکھا۔ شیما نے متوالی آنکھیں ہٹائیں۔ وہ جو کوئی تھا دادی کے پاس آ کر ٹھہر گیا اور آن واحد میں ان کا ہاتھ تھام کر زمین پر دو زانو ہو گیا۔ ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں پر مسل رہا تھا، رگڑ رہا تھا۔ "آصف" دادی نے یوں پیار سے کہا جیسے وہ یہیں رہتا ہو اور جیسے اس کی آمد کوئی تعجب خیز نہیں۔ "کہاں تھا رے۔؟"

وہ اپنا سر پلنگ کی پٹی پر ٹکے زمین پر بیٹھا تھا۔ دادی کا دوسرا ہاتھ اس کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔

"شہر میں دادی۔"

"اچھا کس کے پاس۔!"

"خالہ آپا کے ہاں، زبیدہ پھوپھی کی بیٹی۔"

"اچھا شکر ہے کوئی تو ہمدرد نکلا۔"

کالی پتلون، سفید قمیض، سوکھا سا بانس جیسا لمبا قد، چہرے کا رنگ سانولا مگر ہاتھ بالکل سیاہ تھے۔ جیسے کوئلوں کی کان میں رہتا ہو۔ سارس جیسی گردن۔

"کیا کرتا رہتا ہے۔" دادی کا بس نہ تھا کہ اسے کلیجے میں چھپا لیں۔

"پڑھتا ہوں دادی۔ ایف اے کر چکا ہوں۔ پینٹنگ سیکھ رہا ہوں۔ دوسرے کئی کورس کر رہا ہوں۔" دادی اسے دعاؤں سے لاد رہی تھیں اور شیما ناک سکوڑے بیٹھی تھی۔ وہ اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اچانک اماں جن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا چلائیں۔

"شیما سنتی نہیں' ادھر آ۔ چڑھی بیٹھی ہے۔" شیما کاہلی سے اٹھی اور دھب سے زمین پر بیٹھ گئی۔ آصف پلنگ پر بیٹھ گیا اور بولنے لگا ریکارڈ کی طرح۔ اس نے دوسری طرف دیکھا ہی نہیں۔ بڑے چچا آئے۔ تعجب سے دیکھا۔

"کہاں رہتے ہو۔؟" انہوں نے پوچھا۔

"عالیہ آپا کے ہاں۔!"

"یہ تو بری بات ہے۔" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اظہر بھی تو شہر میں ہے اس کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔"

"سنا نہیں بہن کے گھر بھائی کتا۔" چچی نے طعنہ دیا۔ آصف نے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔

"دولہا بھائی مجھے کہیں جانے نہیں دیتے۔" آصف چچا سے مخاطب رہا۔

"یہاں آجاؤ تو میں تمہیں کام سے لگوا دوں۔ ہمیں ایک پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت ہے۔ تنخواہ معقول ہوگی۔ پٹواری کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔"

"جی نہیں۔" وہ اکھڑپن سے بولا۔ "مجھے ضرورت نہیں' میرا خرچ اچھی طرح چل رہا ہے۔ میں تو آج اپنا حصہ مانگنے آیا ہوں۔"

"کون برداشت کرتا ہے تمہارا خرچہ۔" اسلم زمیندار حصہ والی بات گول کر گئے۔

"اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔" اس نے تڑسے جواب دیا۔ "مجھے جائیداد میں حصہ چاہیے۔"

"کون سا حصہ۔" وہ غضب ناک ہو گئے۔ "تمہارا باپ' ابا میاں کی زندگی میں ہی مر گیا تھا۔"

"مجھے باپ کا نہیں' دادی کا حصہ چاہیے۔" اس نے ترشی سے کہا۔ اسلم زمیندار اماں بی کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

آصف نے بڑے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیری سے کہا۔ "مجھے اپنی دادی کے حق مہر والی زمین چاہیے۔" اسلم زمیندار تڑپ کر ایک قدم ہٹ گئے پھر اماں سے بولے۔ "سنا تم نے اماں بی سن لو۔!" دادی چپ بیٹھی تھیں۔ اسلم کو اپنی بات کا جواب نہ ملا۔ وہ تلملا گئے۔

"میں پورے کاغذات لایا ہوں۔ واضح رہے فوٹو اسٹیٹ' اصل کاغذات میرے وکیل کے پاس موجود ہیں۔ اگر مجھے واضح جواب نہ ملا تو میں قانونی کارروائی کروں گا۔" اسلم زمیندار اسے گھورتے رہے۔ وہ مڑا اور شیما کو مسکرا کر دیکھا۔

"تمہارے ماتھے کا زخم بہت جلدی ٹھیک ہو گیا۔ آنکھ بچ گئی؟ میں سمجھتا تھا پھوٹ گئی ہوگی۔" وہ ہنس رہا تھا۔ شیما پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ دادی چپ' چچا سوچ میں گم تھے۔

"اچھا دادی اب چلتا ہوں پھر آؤں گا۔" اس نے کن انکھیوں سے چچا کو دیکھا اور چلا گیا۔ وہ چلا گیا اور اسلم زمیندار کو الجھن میں ڈال گیا۔ وہ اب زیادہ وقت باہر گزارتے۔ اندر آتے تو بیوی پر بگڑتے رہتے۔

آج یہ ہے کل اظہر کا سامنا کرنا ہوگا۔ سنا تم نے وقت بدل رہا ہے' حالات بدل رہے ہیں۔ آج مزارع بھی سامنے آکر بات کرتا ہے۔ ایک زمانہ تھا منہ میں آواز نہ تھی۔

"اندھیر ہے۔" شیما کی اماں آنکھیں پھاڑ کر کہتیں۔ "پیر کی جوتی سر کو آرہی ہے۔"

شیما کو حالات سے مطلب نہ تھا' وقت کی پروا نہ تھی۔ وہ اپنی ہر ضد منواتی' ہر خواہش کے لیے مچل جاتی۔ اس نے شہر کے کالج میں داخلے کی ضد کی اور اسلم زمیندار مجبور ہو گئے۔ وقت بدل جو گیا تھا۔ اب گاؤں کی لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ وہ تو زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی جس کی ہر ضد کے آگے وہ موم کی طرح پگھل گئے۔ انہوں نے اسے ہاسٹل میں رکھنا منظور کر لیا۔ اظہر کے گھر جانے کی اسے اجازت نہ تھی البتہ ایک بار جب دادی اظہر کے گھر آکر رہیں تو شیما بھی باپ کی اجازت سے ان ہی کے ساتھ اظہر کے گھر دو بار گئی۔

اسے اپنی چچی بہت پسند تھیں۔ خوبصورت' نرم' مہربان' پھر یہ ہوا کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ شیما بھی ترقی کر گئی۔ شہر کے کالج اور ہاسٹل نے اس کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ بہت آزاد' بہت بے باک ہو گئی۔ وہ گستاخی کی منزل پار کر گئی اور والدین سوچتے رہ گئے۔ اگر تعلیم یہی کچھ سکھاتی ہے تو اس کے حاصل کرنے سے ان پڑھ ہونا بہتر ہے۔ وہ خود کو سب سے افضل سمجھتی۔ اس کا دل گاؤں میں نہیں لگتا تھا۔ اکثر وہ اپنی ماں کو شہر جا کر رہنے کی ترغیب دیتی۔ وہ اپنی مجبوریاں بیان کرتیں۔ زمینداری' حکومت' یہ سب شہر میں کہاں ممکن۔

وہ چڑ جاتی۔ "میں نہیں رہ سکتی یہاں' اجاڑ جگہ۔"

"شادی کے بعد رہنا شہر جا کر۔" اماں اسے بہلاتیں۔ اس کے کئی رشتے آئے ہوئے تھے مگر اسلم زمیندار کو جانے کس پری زاد کا انتظار تھا۔ وہ ہر آتے [illegible] رشتہ مسترد کر دیا گیا۔

جب اس نے سنا کہ اس کا جہیز تیار ہو رہا ہے تو وہ بول اٹھی۔ "اماں میں تمہاری پسند کی کوئی چیز نہیں بناؤں گی۔ تمہیں کیا پتہ آج کل کس چیز کا فیشن ہے۔ میں شہر جا کر چھوٹی چچی کے ساتھ سب چیزیں خریدوں گی۔"

اماں کو تلوے سے لگی اور چوٹی پر بجھی۔ "کیوں۔؟" انہوں نے تلملا کر کہا۔ "ان کے ساتھ کیا ضرورت' ایسا ہی ہے تو باپ کے ساتھ جا کر لے آنا۔ ایسی ہی مجھ سے ضد ہے تو۔"

"اونہہ' تمہیں بھی تو چھوٹی چچی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ بس میں نے کہہ دیا میں ان ہی کے گھر جا کر کچھ دن رہوں گی اور ان ہی کی پسند سے سب چیزیں لوں گی۔ تمہاری ضد میں ورنہ ہر چیز کو آگ لگا دوں گی۔"

ایک تو اس کی ضد نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ ضد میں اپنی پسند کے خلاف بھی بہت سے کام کر گزرتی۔ اسلم زمیندار نے کچھ سوچ کر یہ ضد بھی مان لی۔ اسے اظہر کے ہاں چھوڑ آئے۔ چچی نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ بھی بہت خوش تھی۔ ان کے بچے اس سے مانوس ہو گئے۔ اظہر نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ ہوتا ہے خون کا تعلق۔"

وہ چچی کے ساتھ چکر لگانے لگی۔ ایک دن وہ شاپنگ کر کے تھکی ہوئی آئی تو بچے بہت مصروف تھے۔ انہوں نے اندر آکر بتایا۔ "پیارے بھائی آئے ہیں۔" چچی ایک دم مسرور ہو گئیں اور اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ بستر پر لیٹی تھکن اتارتی رہی۔ سہ پہر کو اٹھی' نہا کر کپڑے بدلے اور برآمدے کے اودھم کو دیکھنے کے لیے اس نے دروازے سے جھانکا۔ گڈو نے اسے گھسیٹ لیا۔ "پیارے بھائی' پیارے بھائی آپی بھی کھیلیں گی۔"

اور تب انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا وہ جو بھی کوئی تھا لمبا سا کسرتی جسم کا' بڑی گہری سیاہ آنکھوں والا۔ اس نے شیما کو دیکھا پھر شرارت سے سیٹی بجائی۔ وہ اپنا ہاتھ گڈو سے چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ایک ہی نظر میں وہ شیما کے گوشے گوشے کی تلاشی لے چکا۔ کتنی گہری نظریں تھیں' وہ سٹپٹا گئی۔ اندر آکر بھی وہ ان نظروں کو بھلا نہ سکی اور اس کا دل دھڑک دھڑک کر کہتا رہا۔ یہ میں نے کیا کیا' کیا کیا؟ حالانکہ اس نے نہ کچھ کہا تھا نہ کیا تھا مگر وہ بے چین سی تھی۔ خواہش کہتی تھی ایک بار پھر اسے جا کر دیکھ' وہ تجھے دیکھے۔ وہ نظریں جو پاتال کی خبر لا سکتی ہیں ان میں کھو جا مگر وہ بستر پر پڑی رہی۔ سانس پھولنے لگا۔ تو یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیسی عجیب خواہش تھی۔ وہ اس خواہش کو دبائے کمرے میں قید ہو گئی پھر رات کو اس نے گڈو سے پوچھ لیا۔ "کون آیا تھا آج۔؟"

"ارے پیارے بھائی تھے نا۔" گڈو' بلی ایک ساتھ چلائے۔

"مجھے کیا پتہ کون پیارے بھائی۔"

"کیا واقعی تم نے نہیں پہچانا۔" چچی نے تعجب سے کہا۔ "یہ آصف تھا نا۔"

"آصف!" اس کا سانس رکنے لگا۔ تو یہ آصف تھا' اس قدر تبدیلی کہاں وہ فاقہ زدہ سوکھا جسم' سیاہ کلوٹا بارا چہرہ' نفرت زدہ اور کہاں یہ۔ اسے خاصا افسوس ہوا مگر رات کے بعد یہ افسوس زائل ہو گیا۔ ایک انجانی

ہر وتی نے اسے گھیر لیا۔ افوہ! تو یہ آصف تھا۔ ہمارا رشتے دار، ہمارا اپنا مگر وہ پھر نہیں آیا۔ وہ چاہتی تھی کہ پھر آئے، اسے دیکھے، ان ہی نظروں سے ٹٹولے۔ سینے کی تہہ کو پالے، دل کے راز بھانپ لے مگر وہ نہیں آیا۔ گاؤں واپس آ کر اس کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ اس نے واپس آ کر غلطی کی۔ وہ سوچ رہی تھی شاید بعد میں وہ آیا ہو یا آنے والا ہو۔ چچی سے کہہ کر بلوایا بھی جاسکتا تھا۔ دیکھنا تو چاہیے اب ان کے کیا خیالات ہیں۔ اچانک دادی سخت بیمار ہو گئیں۔ اظہر چچا بھی آ گئے اور دادی نے اسلم زمیندار سے کہا کہ ''وہ سب کے حصے الگ کر دیں۔ ورنہ وہ دودھ نہ بخشیں گی۔''

وہ پریشان ہو گئے۔ دودھ بخشوانے کی تو انہیں پروا نہ تھی مگر سب کے سامنے یہ بات کہی گئی تھی پھر آصف بھی آ گیا اور پھر اس نے اپنی دادی کے حصے کا مطالبہ کیا۔ اسلم زمیندار بال نوچنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی بیوی کو اللہ سے گلہ تھا اگر وہ انہیں بھی ایک بیٹا دے دیتا تو اس کے ہاں کیا کمی ہو جاتی۔ بس ایک لڑکی دے کر ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بھی مشکلوں سے ہوئی تھی۔ جب مزاروں کے چکر لگا کر بیر دھ گئے۔ پیروں کی خوشامد کر کر کے زبان گھس گئی۔ لڑکے کے لیے بھی انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی مگر وہ تو ان کے دشمنوں کے حصے میں آ گئے۔ اظہر کو بھلا دو لڑکوں کی کیا ضرورت تھی اور تو اور جمال کی شادی ان کی شادی کے کتنے دن بعد ہوئی تھی مگر فوراً ہی آصف آ ٹپکا۔ ساری دنیا کے پاس لڑکے تھے۔ نہیں تھے تو ان کی قسمت میں۔

شیما نے اماں سے کہا۔ ''آصف کو دادی کے حصے کی زمین کیوں نہیں دے دیتے۔ اس کا حق تو ہے۔''

وہ زور سے ہنسیں۔ ''لو اور سنو، تمہاری دادی کے حصے میں اس کا حق کہاں سے بنتا ہے۔؟''

''کیوں۔؟'' اس نے پوچھا۔ ''چھوٹے چچا کا بنتا ہے ابا کا بنتا ہے۔ اس کا کیوں نہیں۔؟''

''اس کا تو دادا کی جائیداد میں بھی نہیں بنتا کیونکہ اس کے باپ اپنے باپ کی زندگی میں مر گئے تھے اور ویسے بھی آصف کی دادی دوسری تھی ایک نچلے طبقے کی۔'' انہوں نے شیما کی حیرانی پر یقین دلایا۔ ''واقعی! میں جھوٹ نہیں کہتی۔ ابا جان نے اس سے خفیہ شادی کر لی تھی اسی طرح جمال نے بھی آصف کی ماں سے کی تھی۔ وہ بھی کسی مزدور کی بیٹی تھی۔ گھٹیا خاندان سے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ جمال جس طبقے کی عورت کا بیٹا تھا اسی طبقے کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اب یہ آصف۔!''

شیما کو اس انکشاف سے کوئی افسوس نہ ہوا مگر جانے کیوں اس فرق اور امتیاز کے درمیان کی دیوار گر جانے سے اسے اپنے باپ کا اصلی چہرہ دیکھ کر خوشی بھی نہیں ہوئی۔

اس نے ابا سے کہا۔ ''ابا! آپ آصف کو اس کی دادی کا حصہ دے دیجیے نا۔''

اسلم زمیندار بوکھلا گئے۔ ''ابا کسی کا حق مارنا بہت بری بات ہے۔ اللہ کو جواب دینا ہے، آخر وہ دادا کی بیوی تو تھیں۔ آپ کی ماں نہیں تھیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''تم چپ رہو۔'' انہوں نے غرا کر کہا۔ ''یہ ہمارے مردوں کے معاملات ہیں۔''

''میں نے پڑھا ہے کہ غاصب کے لیے جنت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور میں تو ناانصافی دیکھ نہیں سکتی۔''

اسلم زمیندار شیما کی ہر ضد پوری کر سکتے تھے مگر یہ نہیں۔ انہوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ بڑبڑاتی دادی کے کمرے میں آ گئی۔ ''حد ہو گئی انصاف کی بات تو سن ہی نہیں سکتے لوگ۔'' سامنے سے آصف آ رہا تھا۔ تھکا ماندہ پسینے میں شرابور۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ غنودہ غنودہ، پیشانی پر غور و فکر کی شکنیں تھیں۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی کو مسلتا ہوا آ رہا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک چھپکلی بیٹھی تھی۔ شیما نے بڑے تعجب سے اسے چپل اتار کر چھپکلی پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ ایک لمحے پیشتر کی وہ غنودہ کیفیت آن واحد میں جاگتے ذہن بیدار آنکھوں کی تیز حرکت میں بدل گئی۔

''تمہاری یہ عادت ابھی گئی نہیں۔؟'' وہ حیرانی سے

پوچھ بیٹھی۔ آصف چھپکلی کے تڑپنے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ چونک کر شیما کو دیکھنے لگا۔ "عادت تو نہیں ہے۔ یہ تو انتقام ہے۔"

"تم اس بات کو بھول کیوں نہیں جاتے۔"

"ابا جان واپس آجائیں تو بھول سکتا ہوں۔" اس نے خوفناک سنجیدگی سے کہا۔

"آخر کب ختم ہوگا تمہارا یہ انتقام۔"

"بہت جلد' میں اب ناانصافیوں سے نبٹنے کا اہل ہوگیا ہوں۔ اپنے اوپر ہونے والے تمام مظالم کا حساب لگا رہا ہوں۔ وقت آگیا ہے سب حساب بے باق کردوں گا۔" وہ نہایت اعتماد سے بول رہا تھا۔

"تو تم تڑپاتے کیوں ہو۔؟ ایک دم ہی کیوں نہیں مار دیتے۔"

"تڑپا کر مارنے میں تسکین ملتی ہے۔" اس نے بے خوفی سے کہا۔

دادی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "مارنے دو اسے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ یہ آگ ایسے ہی بجھے گی۔ نہیں تو پاگل ہو کر انسانوں کو کھانے لگے گا۔ جنون ایسا ہی ہوتا ہے۔ دل کی بھڑاس نکل جائے تو اسے سکون ہوجائے گا۔ دوسروں کو بھی۔"

چچی بھی شہر سے آگئی تھیں۔ دادی کی بیماری بڑھ رہی تھی۔ سب تیمارداری میں مصروف تھے۔ آصف اکثر دادی کو تصویر دکھاتا۔ ایک دن بولا۔ "دادی میں نے آپ کی تصویر بنائی ہے۔" اور جب اس نے دادی کو تصویر دکھائی' وہ ہنسنے لگیں۔ وہ ایک نہایت حسین و جمیل عورت کی تصویر تھی جس نے جگمگاتے موتیوں کا ہار اور جھلملاتے ہیروں کا تاج پہن رکھا تھا۔ اس کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ اور شادابی تھی۔ اس کی روشن آنکھوں میں نرم نرم جذبے کا تاثر تھا۔

"یہ کس کی تصویر ہے بھئی۔" اظہر چچا بڑے غور سے تصویر دیکھ رہے تھے۔

"دادی کی۔" وہ بڑی بے نیازی سے دادی کو آلو بخارا کھلا رہا تھا۔

"یہ تو جوان عورت کی تصویر ہے اور شکل بھی اماں سے نہیں ملتی۔"

"میں جب تصویر بناتا ہوں نا۔ تو اس میں اس کی اصل صورت دکھاتا ہوں۔ وہ جو دوسروں کو نظر نہیں آتی۔ صرف مصور کی آنکھ ہی اسے دیکھ سکتی ہے۔"

"اچھا۔!" چچی ہنس دیں۔ "تو تم کو اماں ایسی نظر آتی ہیں۔"

"ہاں یہ دیکھیے۔ یہ ہونٹوں کی مسکراہٹ اور شادابی محبت اور شفقت کی دلیل ہے۔ چہرے پر جو نور کا ہالہ ہے وہ ہے مامتا کا لازوال عروج۔ آنکھیں حق رسی کی نشان دہی کررہی ہیں ان میں جو مدھم سی آنچ ہے وہ اعتماد یقین کی روشنی کو اجاگر کرنے کے لیے ہے اور یہ ہار اور تاج تو جہاں زیبی کی علامت ہے۔ [illegible] علامت۔"

"سچ تم بہت اچھی تصویر بناتے ہو آصف۔!" چچی اسے پرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"میں تو چچی سچ کا مصور ہوں۔ جو محسوس کرتا ہوں وہی تصویر اتارتا ہوں۔"

"واقعی۔!" اظہر نے متاثر ہو کر کہا۔ "تصویر دیکھ کر [illegible] ورنہ مجھ سے [illegible] کھل گئے۔ لگتا ہے یہی سچ ہے۔" دادی بڑی محبت سے آصف کو دیکھنے لگیں۔ اسلم زمیندار بے حد مصروف رہنے لگے۔ انہوں نے ماں کی آخری خواہش کو ٹال دیا۔ شیما' دادی کی بگڑتی حالت اور باپ کے لالچ سے خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اس دن وہ دودھ لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو آصف دادی کے پلنگ پر بیٹھا انہیں سہلا رہا تھا۔ چچا اظہر بھی ان کے قریب بیٹھے تھے اور اسلم زمیندار سامنے کھڑے تھے۔ دادی بمشکل بول رہی تھیں۔

"میری زمین ساری آصف کی ہے جو تمہارے ابا نے مجھے دی تھی۔ میں نے سب کاغذات تیار کرالیے ہیں۔ آصف چاہے تو اسلم کے ہاتھ فروخت کردے۔"

"مجھے آپ کی ذات سے جو کچھ مل گیا دادی وہی کافی ہے۔" آصف رندھے ہوئے گلے سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے جائیداد نہیں' صرف آپ کی زندگی اور آپ کی محبت چاہیے۔"

"بڑھیا کی چالاکی دیکھو۔" اماں باورچی خانے میں نذیراں سے کہہ رہی تھیں۔ "جانے کب اور کیسے اندر ہی اندر اظہر کے سسر کی معرفت اپنی زمین آصف کے نام لکھ دی۔ دنیا میں انصاف نہیں رہا۔ ہم نے خرچ اٹھائے' بھگتان بھگتا' خدمتیں کیں اور زمین اس فقیے کے نام لکھ دی۔ غضب ہے کہ نہیں۔"

پھر دادی چپ چاپ ختم ہوگئیں۔ گھر میں ایک دم سناٹا ہوگیا۔ سب خاموش رہتے۔ جیسے کسی سے خوفزدہ ہوں پھر اظہر شہر چلا گیا مگر چند روز بعد پھر وہی اماں اپنی اہمیت جتانے لگیں۔ ابا نوکروں کو ڈانٹنے لگے۔ شیما کو [illegible] کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔

اسلم زمیندار نے ماں کی خواہش کا احترام تو کیا اس پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ آصف روز دادی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا۔ وہ الگ الگ رہتا۔ بے حد [illegible] شیما کو اس پر بہت ترس آتا۔ بے چارا ساری زندگی محبت اپنائیت کے لیے ترستا رہا۔ دادی کا سہارا تھا وہ بھی [illegible] شغل میں لگ جاتا۔ شیما سوچتی "شاید کسی اپنے کی محبت اسے اس شغل سے باز رہنے پر مجبور کردے۔"

چالیسویں کے بعد آصف اور چچی شہر چلے گئے اور پھر دھماکا ہوگیا۔ چھوٹے چچا نے جائیداد کے لیے مقدمہ دائر کردیا تھا اور اپنا وکیل آصف کو مقرر کیا تھا۔ آصف جس نے ابھی حال ہی وکالت کا امتحان نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اپنے پیشہ ورانہ افتتاح کے لیے کسی ایسے ہی موقع پر کسی اپنے ہی مقدمے کا منتظر تھا۔ اسلم زمیندار سر پکڑے بیٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آصف انتقام کے لیے کتنے پاپڑ بیل سکتا ہے۔ انہوں نے جھک جانا مناسب سمجھا۔ وہ آصف اور اظہر کے سامنے ذلیل نہیں ہونا چاہتے تھے۔

اظہر نہیں آسکا مگر آصف کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ اسلم زمیندار نے انہیں سمجھوتے کے لیے بلایا تھا۔ آصف میں کچھ تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ اس کی بے چین طبیعت میں ایک ٹھہراؤ آگیا تھا۔ وہ جوش و خروش باقی رہا البتہ اب اس میں بلا کا اعتماد پیدا ہوگیا۔ اب وہ بولتا تو کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اس کو جھٹلا سکے۔ مردانہ وقار میں اضافے کے ساتھ ایک بھرپور شخصیت' عملی انسان تھا' جدوجہد کے کندن میں تپا ہوا۔ یہ نیا روپ بھی بے حد دل آویز تھا۔ شیما پہلی بار جو اس کی وجاہت سے متاثر ہوئی تھی۔ اب اس میں ایک اعتدال پیدا ہوگیا تھا۔ ماں' باپ کی نفرت نے اسے محبت سکھادی تھی۔ آصف اور اسلم میں مذاکرات ہورہے تھے۔ شیما بھی سنتی رہتی اور اسے باپ کی مصلحت آمیز پالیسی اور جھوٹ سے نفرت ہوتی جاتی۔ اب اس کے دل میں آصف کا مقام اور بھی بلند ہوگیا تھا۔ وہ ایک لڑکی کے لیے آئیڈیل مرد تھا۔ خوب صورت' مضبوط چٹان کی مانند' باکردار' باصلاحیت' باعمل۔ اس دن اس کی پینٹنگ دیکھتے ہوئے شیما نے پوچھا۔

"آصف تم شادی کب کروگے۔؟" آصف نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔ "بہت جلد۔!"

"پھر بھی۔؟" اس نے اصرار کیا۔

"تم انتظار کرو۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔" اس نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی اختیار کی اور یقین دلایا۔ آصف سوچ میں ڈوب گیا مگر شیما مطمئن تھی' اس کا ضمیر صاف تھا۔ اسلم زمیندار نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلیا اور آصف کو بتایا۔ وہ اظہر کی زمین کا بٹوارہ کرنے پر رضامند تھے۔ آصف ضروری کاغذات کی تکمیل کے لیے شہر چلا گیا اور اسلم زمیندار شیما کے لیے آئے ہوئے رشتے پر بیوی سے صلاح مشورے کرنے لگے۔ شیما نے اپنی ماں سے کہہ دیا۔ "میں شادی نہیں کروں گی۔" اماں جو انتظامات میں مصروف تھیں چونک گئیں۔

"کل آرہے ہیں وہ لوگ بات چیت کرنے۔ آج جو بات منہ سے نکالی ہے آئندہ نہ سنوں' سمجھیں۔" وہ تلملا گئی تھیں۔

"اچھی طرح سن لو اماں' میں اس جگہ شادی نہیں کروں گی۔"

اماں نے کسی کنواری کو اس بے باکی سے شادی کے مسئلے پر بات کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ اپنا آپ پیٹنے لگیں۔

"اس سے کوئی فائدہ نہیں اماں۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔"

"تو کیا کسی کو پسند کرلیا ہے۔" وہ جھلا کر بولیں۔ اس کے اقرار پر قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "کون ہے وہ میں بھی تو سنوں۔"

"آصف۔" اس نے پوری دیانت سے کہا۔ اماں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ شیما کو زور کی ہنسی آرہی تھی اماں کی حالت دیکھ کر مگر وہ ضبط کیے رہی اور پھر جو اماں کے ریکارڈ بجنے شروع ہوئے تو ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ آصف کی کمینگی ان کی بھولی بھالی بیٹی کو پھانسنے کی جرات پر غیض و غضب' چچا' چچی کے کہنے میں آکر ماں' باپ کو ذلیل کرنے والی لڑکی کی نادانی پر طویل لیکچر۔ انہوں نے اسلم زمیندار کو بیٹی کی نئی ضد سنائی۔ وہ بھونچکا رہ گئے۔

"قیامت تک نہیں ہوگا یہ۔" اماں نے واپس آکر کہا۔

"پچھتاؤ گی اماں۔" اس کے اطمینان میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی۔

"دیکھتا ہے کون پچھتاتا ہے۔" اماں طیش میں آگ بگولہ ہورہی تھیں۔

"تم ان لوگوں کو ٹالنے کی کوشش کرو۔" اسلم زمیندار نے بیوی سے کل آنے والوں کے بارے میں کہا۔

"کیا تم اس سے دب جاؤ گے۔" شیما کی امی پریشان ہوگئیں۔

"بات سمجھا کرو اگر ضد پر اتر آئی تو۔۔۔ فی الحال اس معاملے کو ٹال لو۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ساری طراری رخصت ہوگئی جسے ہمیشہ ذلیل کیا' حقیر سمجھا آج وہ اتنی اونچی پوزیشن اختیار کرچکا تھا کہ اس سے کچھ کہہ نہ سکتے تھے مگر شیما کی امی کی زبان رک نہیں سکتی تھی۔ وہ بولتی رہیں۔ شیما نے چڑ کر کہہ دیا۔

"تم مجھے تنگ کروگی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"کہاں جائے گی۔"

"جہاں بھی جاؤں گی تم کو اطلاع بھجوادوں گی۔"

اسے کہتے ہیں سنپولیا۔ اصل سنپولیا ان کی بیٹی تھی جسے دودھ پلا پلا کر پالتے رہے۔ کیسا ڈسا ہے ظالم نے کاش وہ بے اولاد ہوتے۔ ایک ہی دکھ ہوتا مگر اب عزت کی نیلامی' رسوائی' سرگوشیاں۔ نہیں وہ اپنی برسہا برس کی کمائی ہوئی عزت کو یوں نہیں لٹا سکتے۔ انہوں نے بیٹی کی ضد کے آگے سر خم کردیا۔ اماں کو غش پر غش آنے لگے۔ پیر کی جوتی سر کو آرہی تھی چچ چچ۔ آصف اور ان کی لاڈلی کے سر کا تاج بن جائے گا۔ خدا! کیسا اندھیر ہے۔ پچھتائے گی شیما تو پچھتائے گی۔"

اظہر کی سرپرستی میں شہر سے برات آئی' نکاح ہوا اور دوسرے کمرے میں رخصتی ہوگئی۔

آصف کی سنجیدگی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ اس نے شیما کا شکریہ ادا کیا جس نے شادی کے عمل میں آنے تک [illegible] اور [illegible] طرز عمل اپنا کر اس مشکل کو آسان کردکھایا۔

اگلے دن وہ شہر چلا گیا۔ اس کا ایک اہم مقدمہ عدالت میں پیش ہو رہا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے شیما سے کہا۔ "دعا کرنا آج کا مقدمہ میرے حق میں جائے اس پر میری زندگی کی کامیابی کا دارومدار ہے۔"

اور شیما نے سچے دل سے اپنے مجازی خدا کی کامیابی کے لیے دعا کی۔ اس دن وہ واپس نہیں آیا اور دو دن بعد چھوٹے چچا اسے شہر سے پکڑ کر لائے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے کا رنگ پھیکا پھیکا تھا۔ دو راتوں سے وہ سو نہیں سکا۔ اس نے بتایا رات بھر مقدمے سے متعلق ضروری کتب کے حوالے پڑھتا رہا تھا۔ مقدمہ وہ جیت گیا تھا۔ اس نے اسلم زمیندار کے پاس آنے یا ملنے کی کوشش نہ کی۔ رات کو اسلم زمیندار پر ہارٹ اٹیک ہوا' رات بھر بیوی بیٹی اور اظہر کمرے میں جاگتے رہے۔ آصف نے آکر جھانکا تک نہیں۔ صبح نذیراں نے آکر کہا۔ "آصف میاں شہر جارہے ہیں۔"

وہ لپکی ہوئی گئی۔ وہ تیار کھڑا تھا۔ "ناشتہ تو کرلیتے۔" اس نے دبی زبان سے کہا۔

"کرلیا' تم کیا سمجھتی ہو میں آج بھی وہی غلام زادہ ہوں کہ اگر کسی نے ٹکڑا ڈالا تو کھالیا۔ ورنہ۔۔۔۔ میں اب اس گھر کا داماد ہی نہیں' مالک بھی ہونے والا ہوں۔" وہ تلخی سے بولا اور میز پر رکھے کاغذات سمیٹنے لگا۔

"ابا کو دیکھنے نہیں گئے' وہ سخت بیمار ہیں۔"

"مجھے پریشان نہ کرو۔ میں پہلے ہی تھکا ہوا ہوں۔ رات بھر جاگتا رہا۔"

"کیوں۔"

"تصویر بنا رہا تھا۔" اس نے بے دردی سے کہا۔

پھر وہ چلا گیا اور شہر سے ڈاکٹر بلا لایا جس نے اسلم زمیندار کو دوا کی پابندی' پرہیز اور آرام کی تاکید کی۔ شام کو آصف آگیا۔ وہ چھوٹے چچا سے باتیں کرتا رہا پھر ان کے جانے کے بعد شیما کو بلایا۔ وہ بہت خوش [illegible] اپنی خوشی میں شریک کرنے [illegible] کمرے [illegible] دروازے بند کر [illegible]

"کیا کررہے ہو۔" شیما نے اپنے ہاتھ اس کی سخت انگلیوں سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ "میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

"کھانے کو رہنے دو۔" اس نے تلخی سے کہا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اسے بھی بٹھالیا۔

"تم نے میری تصویر اب تک نہیں بنائی۔" شیما نے اسے موڈ میں دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ جیسے سوتے میں جاگا۔ "میں نے تمہیں غور سے دیکھا بھی تو نہیں۔ کل بنادوں گا۔" وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ شیما کا دل دھڑک رہا تھا۔ ادھر باپ کی بیماری' اماں کی پریشانی اور آصف کی یہ گرم جوشی اور مطالبہ۔ اے کاش' ابا بیمار نہ ہوتے۔ شادی کا کچھ بھی مزا نہ آیا۔ وہ اس کے سینے میں سمانے کی کوشش کرنے لگی۔

"زمانے میں وہ حسن اب کہاں پاؤں گا۔" اس نے شیما کی طرف سے نظریں پھیرلیں اور آہ بھرتا رہا۔

"کون سا حسن' کیا مجھ میں کچھ کمی ہے۔" شیما کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ کتنی حسین ہے۔

"مجھے کہیں وہ حسن نظر نہیں آتا۔ تم میں بھی نہیں۔"

"تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں اس لیے نظر نہیں آتا۔" وہ کسمسا کر رہ گئی۔ "کون تھی وہ۔"

"میں نے جو حسن دیکھا تھا اس کے سامنے زمین کی حسینائیں' آسمان کی حوریں ہیچ تھیں۔"

"وہ ہے کون۔؟" شیما کے سینے میں آگ لگنے لگی۔

"میری ماں۔!" آصف نے چھت پر نظریں گاڑ دیں۔ "ہائے کیا حسن تھا مجسم عشق' جلال ہی جلال' جمال ہی جمال۔ ایسا کہ نظر خیرہ ہوجائے۔" اس نے دھکا دے کر شیما کو نیچے گرادیا۔

اور خود اوندھا ہو کر بڑبڑانے لگا۔ "میں اسے کہاں پاؤں' کہاں پاؤں۔" شیما خوف زدہ ہوگئی۔ آصف کے شانے کو چھو کر بولی۔ "کیا ہو رہا ہے تمہیں۔"

وہ چت لیٹ گیا۔ بولا۔ "کتنی کوشش کی میں نے ان کی تصویر بنانے کی مگر وہ پاکیزگی کا جاہ و جلال۔۔۔۔ آہ ہمت نہ پڑی۔ ان کے سراپا کے لیے وفا کی رنگینی کے سات رنگ ہونٹوں کے لیے محبت کے نغموں کی شیرینی کا گداز' آنکھوں میں چاندنی کی کرنوں کا توڑ' رخساروں میں تازہ گلابوں کی شادابی اور صبح کا اجالا گندھا ہوا۔ کیسے بناؤں؟ مجھے تو اس دنیا میں وہ رنگ ہی نہیں ملتے جن سے ان کے حسن کی عکاسی کرسکوں۔" اس نے پوری آنکھیں کھول کر شیما کو دیکھا۔ ہاں اس نے جیسے ہوش میں آکر کہا۔ "چلو کھانا ہی کھالیا جائے۔"

شیما بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی روح پر بوجھ سا آگرا۔ کہاں وہ گرم جوشی کہاں یہ سرد مہری۔ کھانا کھا کر وہ باہر چلا گیا۔ شیما ابا کے پاس آگئی۔ ان کو وقت کی پابندی سے دوا دینی تھی۔ ٹمپریچر لینا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی تھی اور شیما نے یہ ذمہ داری قبول کرلی تھی۔ چھوٹے چچا اور اماں نے بھی تمام رات جاگ کر گزاری۔ شیما تو ٹکٹکی لگائے باپ کی صورت تکتی رہی تھی۔ اسے نہ رات کی خبر تھی' نہ دن

ہونے کی۔ البتہ صبح اس نے اپنے کمرے کا ایک چکر لگایا۔ آصف سو رہا تھا۔ دوبارہ ایک گھنٹہ بعد وہ پھر گئی تو وہ کمرے میں نہیں تھا۔ ابا کی حالت تسلی بخش نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی ایک بار آصف ان کی مزاج پرسی کے لیے آجائے مگر وہ ایک بار بھی ان کے پاس نہیں آیا تھا۔

آصف کو اسلم زمیندار کے ذکر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ بھی اس کی نفرت کے اظہار کا ذریعہ ہی تھا۔ شیما کو اظہر نے زبردستی کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ وہ رات بھر جاگی تھی اگر بیمار ہو گئی تو کون تیمارداری کرے گا۔ یہی سوچ کر وہ لیٹی اور فوراً سو گئی۔ سہ پہر کو جاگی تو معلوم ہوا آصف آج شہر نہیں گیا۔ کمرے ہی میں کچھ لکھتا رہا تھا۔ وہ تیزی سے کمرے میں گئی مگر کمرہ خالی تھا۔ وہ اپنا پینٹنگ کا سامان لے کر چلا گیا تھا۔ شیما سستی سے قدم اٹھاتی غسل خانے میں گھس گئی۔ ہائے، کتنا وقت میں نے سو کر گنوا دیا۔ کاش اپنے ہی کمرے میں سوئی ہوتی، پچھتاتی۔ چپل گھسیٹتی سست چال سے برآمدے میں آئی۔ اماں سرہانے بیٹھی تھیں۔

"کیا ہوا اماں۔" اس نے ڈر کر پوچھا۔

اماں نے ایک ابرو اچکا کر اسے دیکھا پھر منہ پھیر لیا۔ شیما حیران تھی۔ اماں کے انداز میں اجنبیت تھی۔ جب اس نے آصف کے ساتھ شادی کے لیے ضد کی تھی تب بھی اماں اسے کوس کر رہ گئی تھیں اور جب شادی پر رضامند ہوئیں تب بے ہوشی کے ڈرامے کر رہی تھیں لیکن آج اس وقت وہ اداکاری نہیں کر رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی، اماں کو اس سے بے پناہ محبت ہے، عشق ہے جنون کی حد تک لیکن آج کا انداز۔ کچھ بات ضرور ہے۔ اس نے انہیں پکڑ کر ہلا ڈالا۔ اماں بے اختیار رونے لگیں۔ وہ بوکھلا کر ابا کے کمرے کی طرف بھاگی مگر اماں نے اس کا آنچل تھام لیا۔

"اماں کیا ہوا ہے؟" وہ سراسیمگی کے عالم میں بولی۔

"ہونا کیا تھا۔ آصف نے اپنی دادی کے حق کے لیے جو مقدمہ تیرے ابا پر کیا تھا۔ وہ تیرے ابا ہار گئے۔ ابھی مختار خبر لائے ہیں۔ اب مختار مقدمے کی سب روداد انہیں سنا رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے تو خوشی اور غم کی خبر سنانے کی ممانعت کی تھی مگر یہ بات کب تک چھپائی جاتی۔ مقدمہ ہائی کورٹ میں لے جانے کے لیے مشورہ...."

"مقدمہ ہائی کورٹ میں لے جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ بات تم ان سے کہہ دیتیں تو ابا سے یہ خبر پوشیدہ رکھی جا سکتی تھی۔" شیما سوچ رہی تھی۔ اب بھی اماں کو آصف سے وہی کد ہے، اتنی ہی نفرت ہے۔

"اماں، سب حق داروں کو ان کا حق دے دیا جاتا تو آج ابا کا دل اتنا کمزور نہ ہوتا کہ اچھی طرح خبر نہ سن سکیں۔ یہ پیسہ، یہ زمین جائیداد، زندگی تو نہیں دیتے البتہ دل کمزور کر دیتے ہیں۔"

"تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" اماں نے بیزاری سے کہا۔ "پیسے کی تو کوئی بات نہیں مگر عزت اور آن بھی کوئی چیز ہے۔"

"میں خوب جانتی ہوں۔" شیما نے تلخی سے کہا۔ "کتنی عزت ہے ابا کے رشتے دار تو عزت کرتے نہیں۔ پیٹھ پیچھے برائی ہی کرتے ہیں۔ بس منہ دیکھے کی ہی عزت ہے اور کوئی عزت کرے بھی کیوں؟ ابا نے کتنے لوگوں کے حق غصب کر کے جائیداد وسیع کی ہے، پیسہ کمایا ہے اور تم نے بیٹے کی آرزو میں کیسی کیسی بدعتیں نہیں کیں۔ ملا بیٹا؟ کمزوروں پر طاقت آزمائی۔ ہوئی کوئی آرزو پوری؟"

"چپ بدتمیز گستاخ لڑکی۔" اماں آگ بگولا ہو گئیں۔ سچ ہضم کرنا مشکل ہوتا ہے۔

"کاش اماں، کبھی پہلے بھی تم نے مجھے یوں ڈانٹا ہوتا۔ میری ضدوں کو ٹوکا ہوتا۔"

"اپنی اپنی قسمت۔" اماں نے سرد آہ کے ساتھ کہا۔ "ہمارے نصیب میں بیٹا نہ تھا۔ بیٹی کے ہاتھوں ذلیل ہونا لکھا تھا۔ ہائے، سب آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔"

"آرزوئیں آسانی سے پوری نہیں ہوتیں اماں۔ شروع سے تم لوگوں نے مجھے یہ سبق نہیں دیا۔ مجھے سب سے برتری کا احساس دلایا، میری ضدوں کو روکنے کے بجائے انہیں پورا کر کے مزید ہوس کے لیے تیار کیا۔ اماں، مگر میں اتنی بے عقل بھی نہیں۔ آج میں جیسی ہوں تم لوگوں کی بنائی ہوئی ہوں مگر میں شرمندہ نہیں۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں ان مظالم کی تلافی کے لیے جو تم نے اور ابا نے لوگوں پر ڈھائے ہیں۔ نیکی کمانا چاہتی ہوں۔"

اماں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ بولیں۔ "اچھی نیکی ہے، باپ کو بستر مرگ پر ڈال دیا۔"

"خواہشات کا سمندر بہت گہرا، بہت وسیع ہے اماں مگر … ہوں عارضی ساز و سامان کے لیے انسان کیوں اس قدر گہرا … جائے کہ ناکامی پر بستر مرگ سنبھال لے۔ … تو ابا کی … جائیداد، پیسہ، دولت، لے لو نا اس سے زندگی، ابا کی صحت..... مظلوموں کی آہ کبھی خالی نہیں جاتی اماں۔ یہ میں نے پڑھا ہے آج دیکھ بھی رہی ہوں۔ آصف کے ابا کو گھر سے نکلوایا، جائیداد کے لیے سونا … آصف کی دادی کو … قانون کی … اپنا حق … آصف نے عدالت سے اور اس مانگنے کی زبردستی کی دولت کھونے پر ابا بستر پر لیٹ گئے۔"

"بدبخت، وہ تیرے کارن بستر پر لیٹے ہیں تو نے آصف....." اماں کو رونا آ رہا تھا۔ وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر لیٹ گئیں۔ شیما ابا کے کمرے میں گئی۔

"… ہائی کورٹ نہیں جائے گا۔" اس نے مختار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ جائیے اور پھر یہاں آپ کو نہ دیکھوں۔"

اسلم زمیندار پر نقاہت طاری تھی۔ وہ محض قوت ارادی کے ساتھ مختار کی باتیں سن رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہی انجکشن کی تیاری کر رہا تھا۔ شیما کو غصہ تھا۔

"اتنی زمین کا آپ کیا کریں گے۔" اس نے ابا کو … سے سمجھایا۔ "مجھے کچھ نہیں چاہیے، آپ … کر دیں۔ لوگوں کی دعائیں لیں۔ خدا کے لیے … کا صبر نہ سمیٹیں۔" اور وہ بے قرار ہو کر رو دی۔

[illegible] دولت کی ضرورت ہے۔ بس دو گز زمین کا وہ ٹکڑا جس پر کسی کا دعویٰ نہ ہو، کسی کا حق نہ ہو۔ میرے لیے بس اتنی ہی زمین کافی ہے ابا۔" وہ روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اسلم زمیندار پتھر کی طرح ساکت ہو گئے۔

ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ سارا گھر سمٹ کر ان کے کمرے کے باہر جمع ہو گیا۔ نوکر چاکر، مزارع، بڑے سب دعا کر رہے تھے۔ اسلم زمیندار کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ ان کا داہنا ہاتھ مسلسل لرز رہا تھا۔ وہ سخت تکلیف میں تھے۔ اذیت و کرب کی کیفیت نے ان کے چہرے کو مسخ کر دیا۔ اماں رو رو کر کہہ رہی تھیں۔

"ارے اب تو دعا کرو اللہ ان کی مشکل آسان کر دے۔" شیما سدھ بدھ کھوئے باپ کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔ ہر منٹ دوا دی جا رہی تھی، ہر گھنٹے پر انجکشن لگائے جا رہے تھے مگر ان کی تکلیف میں کمی نہیں ہو رہی تھی، اندر ہی اندر تڑپ رہے تھے وہ۔ کونے میں کھڑا اظہر انہیں بے بسی سے دیکھ رہا تھا اور

سوچ رہا تھا۔

"منجھلے بھیا، بڑے بھیا کو معاف نہیں کیا نا تو نے۔ مگر اے اللہ تو اب انہیں معاف کر دے، کہاں اٹکا دی ہے جان، نہ نکلتی ہے نہ ٹھہرتی ہے۔"

شیما اترے ہوئے چہرے خاموش لب لیے ان کے پاس بیٹھی تھی۔ ان کی نظریں شیما میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بار بار اپنا کان ان کے منہ سے لگاتی کہ شاید وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ مگر وہاں ایک خاموشی۔ سرنج ابالنے وہ باورچی خانے آئی تو نذیراں نے بتایا کہ

"آصف میاں کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" شیما نے سرنج اسے پکڑا کر ابالنے کی تاکید کی اور دو منٹ کے ارادے سے کمرے میں گئی، وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

اسے دیکھ کر بیٹھ گیا۔ گھڑی پر نظر ڈال کر اکھڑ پن سے بولا۔ "دو گھنٹے کی دیر۔"

"ابا کی طبیعت بہت......" وہ کہنا چاہتی تھی کہ ان کی حالت نازک ہے مگر وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بے نیازی سے بولا۔ "ادھر آؤ میں انتظار کا عادی نہیں مگر یہ پہلی کوتاہی سمجھ کر معاف کرتا ہوں۔" اس نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔

"میں، میں آجاؤں گی ابھی..... ادھر ابا۔" مگر اس کی بات سننے کی کسے فرصت تھی۔ آصف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی گھسیٹ لیا۔

"میں اس وقت کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں آج بہت خوش ہوں اور اسی خوشی کے موقعے پر ایک جشن منانا چاہتا ہوں۔" شیما نے بوکھلا کر اسے دیکھا، جشن۔ ادھر ابا زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہیں اور اسے جشن کی سوجھ رہی ہے۔ اسے رونا آ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے تو ابا پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ اسی کی وجہ سے فالج اس کی نافرمانی اور موت نے ان کو اس حال تک پہنچایا۔ آخر وقت میں انسان اتنا حساس کیوں ہو جاتا ہے۔ جس نے کبھی کسی کی پروا نہ کی ہو، وہ محض ایک جملے یا دو لفظ سے مات کھا جاتا ہے لیکن وہ تو ابا کے کیے مظالم کی تلافی کرنا چاہتی تھی، انہیں مزید کسی ظلم سے روکنا چاہتی تھی، انہیں محض یہ جتانا چاہتی تھی کہ ان کے اقدام کو ان کی بیٹی بھی اچھا نہیں سمجھتی پھر وہ سمجھے کیوں نہیں۔ ابھی تک جوڑ توڑ میں لگے رہے۔ ذرا سا زمین کا ٹکڑا ہاتھ سے جاتے دیکھ کر بیمار ہو گئے۔ دنیا سے اتنی محبت کس لیے؟ وہ آصف کی دیوانگی سے پریشان ہوتی جا رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے جانے دو، ابا کی حالت اچھی نہیں ہے۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔"

"مگر مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے تندی سے کہا۔ وہ ڈر گئی۔ "ابا میرے بغیر....." وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے بغیر بے چین ہوں گے۔ ان کی آنکھیں ایک لمحے کو اس کی دوری برداشت نہیں کرتیں۔

"مرنے دو انہیں۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "میں اپنا جشن منانا چاہتا ہوں [illegible] جشن ہو جائیں [illegible]" اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ وہ بے حد جوش میں تھا۔ لاپروا، بے نیازی اور سرور۔

"میں پھر آجاؤں گی سچ۔" اس نے التجا کی۔ آصف کی آنکھوں میں [illegible] غضب کی چنگاریاں لپک رہی تھیں۔ اس نے شیما کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جیسے پرانے زمانے میں مجرموں کو باندھ کر ٹکٹکی پر چڑھا دیا جاتا تھا اور وہ درد سے بلبلا جاتے تھے۔ شیما بھی بلبلا کر رو دی۔

"میں وقت کا انتظار نہیں کرتا۔" اس نے غرا کر کہا۔ شیما بے بس تھی۔ ابا اس کے انتظار میں دروازہ تک رہے ہوں گے، وہ ان کو سہلاتی تھی تو انہیں سکون ہوتا تھا۔ وہی تو منٹ منٹ پر دوا کا چمچہ ان کے منہ کو لگاتی تھی، ٹمپریچر دیکھتی تھی۔ اماں تو حوصلہ ہار کر باہر جا بیٹھی تھیں۔

آصف اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ "تو تم کو بھی میری قربت گوارا نہیں۔" اس نے غرا کر کہا۔ "تمہیں بھی اپنے ماں، باپ کی طرح مجھ سے نفرت ہے، ہے نا؟"

"نہیں۔" وہ چلا اٹھی۔ وہ تو اس لفظ سے بھی نفرت کرتی تھی۔ وہ تو آصف کی محرومیوں کا ازالہ کرنے اپنے ماں باپ کے ظلم کی تلافی کرنے کی خاطر اس کی بنی تھی۔ اسے محبت دینے، اسے ٹھنڈک پہنچانے کے لیے، اس کے دل کو قرار دینے کے لیے، ماں باپ سے لڑ کر اس کی ہوئی تھی۔

"تو پھر تم میرے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتیں۔" اس کی نظریں آج پھر شیما کے اندر کے گوشوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ "میں آج خوش ہوں۔ تم رنجیدہ ہو۔ میں ہنس رہا ہوں۔ تم رو رہی ہو اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے، ذرا سا خیال ہے تو سنو۔ میری خاطر، میرے لیے ہنسو۔" وہ آصف سے ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگنے کو تھی مگر آصف نے اسے پکڑ لیا۔ "نہیں جانے دوں گا، نہیں جانے دوں گا۔" وہ غرایا۔

دستک ہو رہی تھی [illegible] ٹیپ ریکارڈر سے تیز تیز موسیقی کی لہروں میں باہر کی آواز گم ہو جاتی۔ وہ اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا۔ شیما اس کی بانہوں میں ٹکٹکی پر چڑھی ہوئی تھی۔

"او بی بی، وہ بلا رہے ہیں۔" نذیراں پکار رہی تھی۔ اماں بلا رہی تھیں جب وہ [illegible] کی بیٹی کو زیر کر کے فتح کا جشن منا رہا تھا اچانک ایک کاغذ شیما کے ہاتھ میں آگیا، اس نے [illegible] موڑ کر دیکھا اور اچانک اسے بے حد خوشی کا احساس ہوا۔

کاغذ پر کسی دلہن کی تصویر تھی تو آصف نے اس کی تصویر بنائی تھی۔ یہ اس کی شادی کا جوڑا تھا۔ تصویر میں اس کے جسم کو بے حد لچکدار سڈول بنایا گیا تھا۔ مخروطی حنائی انگلی میں یاقوت کی انگوٹھی جیسے خون کا قطرہ ٹپک گیا ہو۔ مڑے تڑے کاغذ کو سیدھا کر کے کسی طرح اس نے اوپر کی سمت دیکھا۔ گردن سے اوپر ایک خوفناک چھپکلی کا سر بنا ہوا تھا۔ شیما کا سانس رکنے لگا۔ وہ انتہائی خوفزدہ ہو گئی۔

"مارنے دو، کلیجہ ٹھنڈا ہونے دو اس کا۔" اسے دادی کی آواز دور سے سنائی دی۔ اس نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ خود کو آزاد کرنے کی کوشش ترک کر دی۔ اب وہ آصف کے رحم و کرم پر اس کے انتقام کی زد میں تھی۔ کاش اس انتقام سے ابا کو سکون مل جائے، نجات ہو جائے۔ ان کی، ان کے ظلم کی تلافی ہو جائے۔ کاش آصف کے دل کو قرار آجائے، اس کی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔

دروازے پر ابھی تک نذیراں کھڑی پکار رہی تھی، دستک دے رہی تھی۔ آصف کے عمل میں جوش ہی جوش تھا۔ مسرت کا نہیں انتقام کا۔ اس کے چہرے پر نفرت کے سائے تھے۔ زندگی بھر کی نفرت اور زیادتی کا انتقام وہ آج ہی شیما سے لینا چاہتا تھا۔

"اے اللہ ابا کی مشکل آسان کر دے، ان کو زندگی کے کرب سے چھٹکارا دے دے۔ میں ان کی زیادتیوں کا کفارہ دے دوں گی۔ آصف کے انتقام کا نشانہ بنتی رہوں گی، سب کچھ سہہ لوں گی۔ بس ابا کو زندگی سے نجات دے دے۔ آصف کی نفرت کی آگ کو ٹھنڈی کر دے۔"

آصف جنونیوں کی طرح پیش آرہا تھا۔ نفرت نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ انتقام کی آگ تیز سے تیز ہو رہی تھی۔

اچانک اسے احساس ہوا۔ شیما بالکل کشمکش نہیں کر رہی۔ اس نے خود کو آصف کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ اس کے انتقام کا نشانہ بننے کے لیے رضامند ہو گئی ہے۔ نفرت کے اظہار میں بھی اس سے تعاون کر رہی ہے۔ اس کی ساری نفرت اور جوش انتقام جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ بے یقینی سے اپنے دشمن کی مفتوح بیٹی کو دیکھنے لگا۔ وہاں نفرت نہیں، محبت تھی۔ اس کی آنکھوں میں آصف کے لیے محبت کا پیام تھا۔

دروازے پر دستک بہت تیز ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دستک بڑھتی جا رہی تھی۔ نفرت کی، انتقام کی آگ سرد پڑ گئی تھی۔

دستک بڑھتی ہی جا رہی تھی اور تیز...... اور تیز